شانِ امن

Office of the Registrar
780
2-99
Andhra Pradesh, Hyderabad

رئیسہ بیگم

Acc. No. 530

جملہ حقوق بہ حق مصنفہ محفوظ

سالِ اشاعت : ۱۹۹۸ء

کتابت و طباعت : مان پبلیکیشن خیریت آباد

تعداد : ۲۵۰

قیمت : ۲۵ روپئے

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

ناشر رئیسہ بیگم

جواد پبلیکیشن مکان نمبر 12_2_709/C/52 "پُر سکون" پدمانابھا نگر کالونی

حیدرآباد۔ ۲۸ اے۔پی

ملنے کے پتے

آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی

"رئیسہ محمد" پلاٹ نمبر ۵۲ پر سکون۔ پدما نابھا نگر کالونی

مدرسہ نامپلی گاندھی بھون حیدرآباد آندھرا پردیش

حسامی بک ڈپو مچھلی کمان

مینار بک ڈپو چار مینار

Acc. No. 530

اپنی اکلوتی بیٹی آسیہ بیگم (گُلِ نو) کے نام

جسے اُردو زبان سے لگاؤ ہے خدا اسکی عُمر دراز کرے اسکے عِلم میں اضافہ کرے۔ اسکے دل میں اُردو کی محبّت اور زیادہ بڑھ جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے والدین کا نام روشن کرے اور اسکے ساتھ ساتھ اپنے دوست واحباب و اولاد کو اُردو سے روشناس کروائے۔

780
2-99

رئیسہ بیگم

تاریخِ پیدائش - ۱۱ اگست ۱۹۴۳ء

ایم اے - ۱۹۶۹ء

بی ایڈ - ۱۹۷۰ء

ملازمت - پیشہ تدریس ۱۹۶۱ء تا حال

پتہ - رئیسہ محمد

مکان نمبر 12-2-709/C/52 "پرسکون" پدمانا بھا نگر کالونی حیدرآباد -۲۸

آندھرا پردیش

مصنفہ کی زیرِ طبع کتابیں

ظہیر دہلوی کی ادبی خدمات -

ظہیر دہلوی ایک کلاسیکی شاعر -

مجموعۂ مضامین سماج سدھار

مجموعۂ مضامین طنز و مزاح (بس مسکرائیے)

مزاحیہ ڈرامے

تفریحِ طبع ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱
نقلِ مقام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۷
شانِ امن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۱
وہ بھی ہیں آدمی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۵
تضحیکِ روزگار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹
شعلۂ منافرت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۵
بہار کا اثبات چاہیئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۱
کُدورت پنہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۵
کُہرام نہ سہی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۱
اُجلا میلا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۵
ٹکڑے ٹکڑے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۹
دہقانِ ناتوان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۳
نیلا پانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۷
تعلیم و خواتین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۳
فیشن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۷
شکمِ داغدار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۳
احوال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳۷
قربتِ قلوب چاہیئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴۳

11, 12 Blank

ٹیچر نظام کالج کے ایوننگ سیشن سے بی۔ اے کی تکمیل کی اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے یم۔ اے اور بی ایڈ درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ان کی ساری تعلیم اردو میڈیم میں ہوئی۔

ادبی ذوق:۔ محترمہ جس وقت بی۔ اے فسٹ ائر میں ایوننگ کالج میں زیرِ تعلیم تھیں تو اُن کے پروفیسر صاحب جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے اُن کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ایوننگ کالج کے میگزین "شب تاب" میں رئیسہ بیگم کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

محترمہ کی شادی ۱۹۷۴ء میں جناب فقیر محمد جواد سے ہوئی ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہے۔ جس کی شادی ہوچکی ہے۔

ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی رئیسہ بیگم کا ادبی سفر جاری رہا۔ ان کے کئی مضامین "سب رس" "سیاست" "رہنمائے دکن" اور اردو اکیڈیمی کے میگزین "قومی زبان" میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ ایک اچھی کالم نگار۔ ڈرامہ نویس اور نثر نگار ہیں۔ ان کے نثری نگار شات "سماج سدھار" پر مرکوز ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل بتلایا جاچکا ہے۔ کہ رئیسہ بیگم تدریسی پیشے سے وابستہ ہیں۔ بہت ہی فرض شناس۔ مستعد اور قابل ٹیچر مانی جاتی ہیں۔

انھیں ۱۹۹۱ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے "BEST TEACHER" ایوارڈ دیا گیا۔ یہ کُل ہند اُردو تعلیمی کمیٹی کی نہ صرف ممبر ہیں بلکہ اس کی کانفرنس کی organiser بھی ہیں۔ اپنی اکرام جیوتی اسکیم کے تحت

انھوں نے ملازمین کو دستخط کرنا بھی سکھایا ہے اور اس سلسلے کو جاری بھی رکھا ہے۔ جنم بھومی پروگراموں میں انھوں نے خاطر خواہ حصہ لیا۔ محترمہ کا "MOTTO" ہے۔

WORK IS WORSHIP

"کام عبادت ہے"

اس کو انھوں نے اپنی تحریروں اور عمل سے ثابت کر دکھایا۔ ان کی یہ کتاب "شانِ امن" دراصل قومی یکجہتی پر محیط ہے۔ ان کا عمیق مشاہدہ اور درد بھرا دل ان مضامین کے لکھنے کا باعث ہوا۔

قارئین کرام! آپ میری رائے سے متفّق ہونگے کہ محترمہ نہ صرف ایک اچھی ادیبہ ہیں بلکہ نقّاد اور مزاحیہ نگار بھی۔ ان کا انداز بیان بہت ہی دلکش ہے۔ سلیس اردو زبان میں بہت ہی خوبصورت انداز میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جو حقائق پر بنی ہے۔

شاعر ہو یا نثر نگار وہ اپنی شخصیت کو ماحول۔ سماج اور معاشرے سے دُور نہیں رکھ سکتا۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اس سے اس کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ سماج اور معاشرہ میں جو بُرائیاں اسے دکھائی دیتی ہیں تو ان کے ازالے کے لئے اپنے قلم کو استعمال کرتا ہے۔ جو باتیں سماج میں انتہائی تکلیف دہ ہوں جس سے انسانیت داغدار ہو جائے اسکو رئیسہ بیگم نے مثالوں سے سمجھایا ہے۔ بہرحال دردو سوز سے بھرے ہوئے الفاظ سے ان کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکے اس کا

حل بھی بتلایا گیا ہے۔

سماج اور معاشرے میں جو برائیاں ہیں وہ جہالت خود غرضی۔ تنگ نظری اور مذہب سے دُوری کی وجہ سے ہیں۔ اگر ہم اپنی اولاد کو تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین اخلاقی تربیت دیں تو اِن خرابیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

سارے مذہبی عقائد آپسی محبّت اتحاد اور ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کا درس دیتے ہیں۔ اِن اُصولوں پر گامزن ہو کر ہم حقیقی معنوں میں اپنے خاندان اور قوم کے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسان جو کائنات کی تخلیق کا شاہکار ہے اور اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اس کا عمل اس کے شایانِ شان ہونا چاہیئے۔ ہر لمحہ انسان کے دل میں خوفِ خدا ہو اور مواخذہ کا ڈر ہو۔ وہی اصل انسان کہلانے کا مستحق ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ محترمہ رئیسہ بیگم کو اس مساعئ جمیلہ پر اجرِ عظیم دے۔ عمر میں برکت عطا کرے اور ہمیشہ صحت وعافیت سے خوش وخرّم رکھے۔ (آمین) تاکہ وہ اس طرح اپنے ادبی سفر کے ذریعہ دین و دنیا دونوں کی خدمت کرتی رہیں۔

مجھے امید ہے کہ قارئینِ کرام ان کی اس کتاب کو بہت پسند کریں گے۔

قادری بیگم

Prof. Mrs. Qadri Begum Razvi
(Ex.) Principal Womens College
Kothi, Hyderabad (A.P)

تعارف

رئیسہ بیگم ایم۔اے میں میری شاگرد تھیں۔اب وہ پیشۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ایم۔اے میں انھوں نے ظہیر دہلوی پر اچھا مقالہ لکھا تھا۔نثرنگاری سے انھوں نے اپنا شغف اب بھی جاری رکھا ہے۔ان کی دل چسپی کا مرکزِ ادب سے زیادہ سماجی اور معاشی مسائل ہیں جن پر وہ انشائیوں کے انداز میں مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ان کے اکثر مضامین مقامی روزناموں میں شائع ہوچکے ہیں۔یہ ایک طرح سے صحافتی تحریریں ہیں جن کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہے،ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے (انھوں نے اپنے مضامین میں قومی یک جہتی کی ضرورت اور باہمی اتفاق اور محبّت پر بہ طور خاص زور دیا ہے) ان کے پیشِ نظر زیادہ تر اپنے سماج کے اندورنی سیاسی ومعاشی اور مسائل ہیں لیکن وہ ان مسائل کو عالمی تناظر میں بھی دیکھتی اور پیش کرتی ہیں۔

سماجی زندگی کی بہت سی بُرائیوں پر اُن کی نظر ہے جن کے پسِ پردہ وہ معاشی اور سیاسی محرکات کو دیکھتی ہیں جیسے معاشی عدم مساوات،غریبوں اور کسانوں پر مظالم، معاشرتی مسائل میں توہم پرستی، لڑکیوں کو شادی کے بہانے تعلیم سے محروم کرنا، بھیک مانگنے کی وبا اور اس کے مذموم طریقے، اونچے طبقے کی برائیاں، فیشن زدگی وغیرہ بھی مصنّفہ کی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔ان کا خاص نقطۂ نظر یہ ہے کہ ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اَمن واماں کی فضا قائم نہ ہو اسی طرح

اقوامِ عالم کی ترقی اور وسیع تر انسانیت کی بہبود کے لئے بھی عالمی امن ضروری ہے اسی لئے انھوں نے کتاب کا نام "شانِ امن" رکھا ہے۔

ان مضامین کی خاص خوبی ان میں رواں دواں دردمندی کی لہر ہے جس کی وجہ سے وہ دل پر اثر کرتے ہیں۔ ورنہ خالی خولی نصیحت کی باتوں سے عام طبائع دور بھاگتی ہیں۔

رئیسہ بیگم اپنی تحریروں میں انشائیے کے رنگ کو اور گہرا کرلیں تو ان کی اپیل موقتی نہیں رہے گی بلکہ انھیں حیاتِ دوام مل جائے گی

موجودہ صورت میں بھی یہ مضامین اور انشائیے اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو داں اصحاب کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب کو خرید کر پڑھیں اپنے اہل خاندان اور بچوں کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔

مجھے امید ہے کہ رئیسہ بیگم کی دل سوزی بے کار نہیں جائے گی۔

مغنی تبسم

سابقہ صدر شعبہ اردو

عثمانیہ یونیورسٹی

دیباچہ

میرے ادبی، سماجی، اصلاحی مضامین گو کہ مختلف رسائل "سب رس"، "قومی زبان"، "شب تاب" اور اخبار "سیاست" و "رہنمائے دکن" وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں لیکن مجموعہ مضامین کو کتاب کی شکل میں پیش کرنے کی پہلی کوشش کر رہی ہوں۔ بعض مضامین کو دِلّی کے ہندی میگزین میں بھی بعد ترجمہ شائع کیا گیا ہے میں نے اصلاحی مضامین کے علاوہ طنزیہ، مزاحیہ مضامین و افسانوں پر بھی توجہ دی ہے لیکن نہ معلوم کیوں طبعیت اسی کی طرف سب سے پہلے مائل ہوئی کہ میں نے اپنا مسودہ اردو اکیڈیمی میں داخل کر دیا اور پھر اسکا انتخاب عمل میں آیا۔ میں جناب مسعود بن سالم ڈائرکٹر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مشکور ہوں کہ انہوں نے نہ صرف اُردو ڈائرکٹری میں میرا نام شامل کیا بلکہ میری ہمت افزائی بھی کی۔ میرے استاد محترم پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب مرحوم کا ذکر یہاں پر انتہائی ضروری ہے کہ جن کی تعلیم و تربیت نے آج مجھے اس لائق بنایا۔ انہوں نے مجھے اُردو اکیڈیمی سے متعارف کیا اسکے علاوہ ڈاکٹر مغنی تبسّم صاحب اور جناب منظور احمد صاحب کا بھی میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ دونوں حضرات نے اپنے گراں قدر مشورے سے میرے کام کو آگے بڑھایا اور میری کتاب کا تبصرہ لکھنا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

میری ادبی کاوشوں کو وسعت دینے میں جناب جلیل پاشاہ صاحب صدر کُل ہند اردو تعلیمی کمیٹی و سابقہ چیرمن اردو اکیڈیمی کا بڑا ہاتھ رہا اسکے علاوہ ہمارے مدرسے کے ہیڈ ماسٹر جناب کے جاردھن راؤ صاحب صدر کل ہند ٹیچرس فیڈریشن نے میرے مضامین کو سلسلہ وار پڑھا اور میری ہمت افزائی کی اور اس کتاب پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا۔ جسکے لئے میں جناب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جس شخصیت نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی ہے وہ ہیں محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیاء سابقہ صدر شعبہ اردو ویمنس کالج کوٹھی جن کا میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ وہ نہ صرف رہنمائی کی بلکہ اپنی رائے سے بھی شانِ امن میں اضافہ کیا۔

ان تمام ادبی شخصیتوں کے بعد میں جن کا ذکر کرنے جارہی ہوں وہ نہ صرف ایک ادیبہ ہیں بلکہ ایک بہترین سماجی کارکن بھی وہ ہیں محترمہ پروفیسر قادری بیگم صاحبہ سابق پرنسپل ویمنس کالج کوٹھی محترمہ نے نہ صرف میرے مضامین کو پڑھا بلکہ اپنے بہترین پیش لفظ سے میرا تعارف بھی کروایا اس لئے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔

ان تمام سے ہٹ کر میری ہمت افزائی کرنے والوں میں خاص کر ایڈیٹر "سیاست" جناب عابد علی خان صاحب مرحوم و جناب زاہد علی خان صاحب کی میں انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے فسادات کے دور میں میرے مضامین کو مسلسل اپنے اخبار میں شائع

کیا جو ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء امن و آشتی کے لئے مؤثر ثابت ہوئے اور شانِ امن میں اضافہ ہوا۔

اب آخر میں عزیز و اقارب و دوست احباب کا شکریہ ادا کرنا مناسب سمجھتی ہوں سب سے پہلے گھر کے افراد اور ماحول اس لئے کہ ادبی مشغلوں کو جاری رکھنے کے لئے پرسکون ماحول کی بڑی ضرورت و اہمیت ہے ویسے میں نے اپنے گھر کا نام ہی "پُرسکون" رکھا لیا ہے۔ یہاں پر نہ صرف مجھے سکون ملا بلکہ اسکے ساتھ ساتھ میرے شوہر محترم فقیر محمد جواد صاحب و دختر آسیہ بیگم (گل نو) دونوں کا مکمل تعاون رہا یہ دونوں بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

میرے دوست و احباب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے بھی میرے مضامین کو پڑھا اور سراہا۔

امید کہ یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی اور سب ہی اس کتاب کو پڑھیں گے۔

رئیسہ بیگم

چند تاثرات

رئیسہ بیگم صاحبہ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی اچھی کتابوں کے مطالعہ کی عادت رہی ہے جس کی وجہ سے وہ اُردو کا معیاری ادب پڑھتی رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی اہل ذوق میں لکھنے کی تھوڑی سی بھی صلاحیت ہو اور اگر وہ مسلسل چند سال تک نہایت توجہ، دلچسپی اور پابندی سے ممتاز اور منتخب انشا پردازوں کی نگارشات پڑھتا رہے تو اس کے دل میں بھی کچھ لکھنے بلکہ لکھتے رہنے کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ معیاری تخلیقات کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ، جو کچھ پڑھا ہو اس پر غور کرنے کی بھی صلاحیت ہو تو ایسے قلمکار کی تحریریں کچھ ہی دنوں میں نکھری ستھری ہوجاتی ہیں۔ رئیسہ بیگم صاحبہ نے ادبی رسالوں اور اردو کی معیاری تصانیف نظم و نثر کا مطالعہ کیا ہے۔ صفِ اول کے ادیبوں کی نگارشات کے پڑھنے سے انہیں بھی مضامین لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مختصر سی مدت میں انہوں نے اُردو میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خود اعتمادی کے بغیر، کوئی کام سلیقے سے نہیں کیا جاسکتا۔ لکھنے کے میدان میں قدم رکھنے کے لئے تو پہلی شرط خود اعتمادی ہی ہے۔ خود اعتمادی سے لکھنے کا حوصلہ بلند ہوتا ہے تب ہی لکھنے کا مشغلہ ایک پسندیدہ مشغلہ کی صورت میں ہمیشہ جاری بھی رہ سکتا ہے۔ محترمہ کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے اسی لئے انہوں نے قلمکاروں کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ وہ لکھ رہی ہیں اور ان کی نگارشات کے پڑھنے کے بعد ایک عام قاری

بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ آسان زبان اور دلچسپ پیرایہ میں اپنے خیالات پیش کرنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ محترمہ کا معیاری اُردو ادب کا گہرا مطالعہ ہے اسی طرح اگر وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کے مسائل پر نظر رکھیں اور ان مسائل پر غور کرتی رہیں، تو مجھے اُمید ہے کہ اچھے مضامین لکھنے کا یہ مشغلہ جاری رہے گا۔ ہر اچھے لکھنے والے قلمکار کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ جب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں لکھ رہا ہے بلکہ غیب سے اس کے خیال میں یہ مضامین چلے آرہے ہیں اور ایک غیبی طاقت اسے کچھ نہ کچھ لکھنے پر اُکساتی اور اُبھارتی رہتی ہے جس کے زیر اثر وہ تخلیقات کے انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔ رئیسہ بیگم صاحبہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ اس لئے وہ اچھی، معیاری، معلومات افزاء اور فکر انگیز کتابیں پڑھتی رہتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھتے رہنے کے لئے صفِ اول کے ادیبوں کی تحریریں ہمیشہ قوتِ محرکہ کا کام کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ادب کا دامن مضبوطی سے تھامنے والے، اپنی معیاری تخلیقات کی بدولت کچھ عرصے کے بعد، ادیبوں کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ رئیسہ بیگم صاحبہ کے ان مختصر مضامین کے پڑھنے کے دوران یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ مختلف اور متنوع موضوعات پر اگر وہ پابندی سے لکھتی رہیں گی تو قوی توقع ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ایک اچھی ادیبہ ثابت ہونگی۔ منتخب مضامین کا زیرِ نظر مجموعہ رئیسہ بیگم صاحبہ کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ گویا یہ کسی فن کار کا نقشِ اول ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ نقشِ ثانی میں

ان کے لکھنے کی صلاحیت کچھ اور نکھری ہوئی محسوس ہوگی اور اس طرح وہ اچھی تخلیقات کے مجموعوں کی صورت میں ایک طویل عرصے تک ہمارے ادب میں خوشگوار اضافہ کرتی رہیں گی۔ خدا کرے کہ ایسا ہو۔

مضامین کے اس پہلے مجموعہ کی اشاعت پر میں اُن کی خدمت میں خلوص دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ

اللہ کرے، مرحلۂ شوق نہ ہو طے

۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء

محمد منظور احمد

22.1.732/1

دارالشفاء، حیدرآباد۔ ۲۴ (اے پی)

میری رائے

شانِ امن رئیسہ بیگم کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کا ہے۔ مصنفہ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے بہت ہی اچھوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن پر بہت کم توجہی گئی ہے۔ مذہبی رواداری، قومی یک جہتی، مساوات، انسان دوستی اور اسی قسم کے کئی اہم موضوع ہیں جن پر مصنفہ کی گہری نظر ہے۔

دہقانِ ناتواں، تکڑے تکڑے، کدورت پنہاں، شعلۂ منافرت، تضحیک روزگار اور دوسرے مضامین میں سماج کی مختلف برائیوں کو پیش کیا ہے۔

میں رئیسہ بیگم کو ان کی پہلی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ مسلسل لکھتی رہیں۔ اُمید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند فرمائیں گے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء

یم اے۔ پی ایچ ڈی

سابق صدر شعبہ اردو ویمنس کالج کوٹھی

عثمانیہ یونیورسٹی

اے۔ پی

میری رائے

رئیسہ بیگم کو میں اپنے اسکول کی ایک بہترین معلمہ ہی سمجھتا تھا لیکن جب میں نے اُن کے مضامین سیاست میں پڑھے جن کے عنوانات انتہائی دلچسپ اور پُر درد تھے اُنھیں ادیبہ کے خطاب سے مخاطب کرنے لگا۔ محترمہ اپنی مصروفیات کے باوجود نہ صرف اسکول کی مصروفیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں بلکہ اپنے ادبی سفر کو بھی جاری رکھا۔ "شانِ امن" میں محترمہ کا انداز تحریر واسلوب قاری کے لئے متاثر کُن ہے۔ انھوں نے اپنے نوکِ قلم سے سماج کے زخموں کو نہ صرف عیاں کیا بلکہ اس کی اصلاح بھی کی ہے۔ میں نے بعض مضامین کا ہندی میں بھی ترجمہ کروایا ہے اور دِلّی میگزین میں شائع کرنے کے لئے اُنھیں ترجیح دی ہے خاص کر "قربتِ قلوب چاہئے" اور "کُدورت پنہاں" میں انسانیت کے سدھار اور اصلاح معاشرہ پر آپ کی خاص نظر ہے۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ آپ اپنے تمام مضامین قومی یکجہتی کو "شانِ امن" کے عنوان سے کتابی شکل دے دی ہیں۔ میں محترمہ رئیسہ بیگم کو اس کتاب کی اشاعت پر مُبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید ہے کہ شانِ امن قارئین کو پسند آئے گی اور ہر ایک اس سے مستفید ہوگا۔

کے۔ جنار دھن را

صدر کل ہند ٹیچرس فیڈریشن

تعارفِ شانِ امن

ایک قلم کار اپنی تحریر اور اپنی تصانیف کے ذریعہ اپنے آپ کو متعارف کرواتا ہے ۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ایک شاعر اپنی شاعری کو وسیلہ بناتا ہے نثر نگار اپنی تصانیف اپنے نثرپاروں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن شاعر ہو یا نثر نگار وہ اپنی شخصیت کو ماحول اور سماج اور معاشرے سے دُور نہیں رکھ سکتا ۔ اسلئے کہ اِنسان ایک سماجی جانور ہے ۔ MAN IS A SOCIAL ANIMAL اور وہ جس ماحول میں رہتا بستا ہے اس سے متاثر ہوئے بِنا نہیں رہ سکتا ۔ روز مرّہ کے حالات واقعات اور پاس پڑوس کی باتیں اس کے احساسات کو چُبھتی ہیں ۔ اِن بُرائیوں کو سُدھارنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اور ایک قلم کار اپنے قلم کو ہی اپنا ہتھیار بنا کر ان بُرائیوں کے خاتمہ کی طرف مائل ہوجاتا ہے ۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھنے پر ہمیں یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ ہر دَور میں شُعرا اور نثر نگاروں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے قلم سے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں ۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ شاہوں نے حکماء نے سلطنت یا شہر کے حالات کے مدِ نظر قلم کاروں کی مدد بھی طلب کی ہے ۔ میں نے بھی کچھ ایسے ہی حالات و واقعات سے متاثر ہوکر شخصی طور پر نہ سہی اخباروں کی خبروں اور سُرخیوں کو سماج و معاشرے کے حدود میں طنز و تنقید کے ذریعہ اِصلاح معاشرے کا بیڑا اُٹھایا ہے ۔ بعض مضامین میں

جانوروں اور پرندوں سے بھی درس دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ قارئینِ کرام اس سے ہرگز یہ مطلب نہ لیں کہ اِن کی انسانیت کو ٹھیس پہنچائی جارہی ہے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے تاکہ سماج کا ہر طبقہ اسکو بہ آسانی سمجھ سکے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اِس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ دلچسپی باقی رہے اور قارئینِ کرام کو زحمت نہ ہو ۔ بُرائی اور اچھائی میں تمیز کو سمجھانے کے لئے نفرت و حقارت اور بعض مقامات پر خُلوص و مُحبت خوشبو اور شگفتگی کا سہارا لیا ہے جو باتیں سماج میں انتہائی تکلیف دہ ہیں اور جن سے ہر اچھے انسان کے ضمیر کو تکلیف پہنچتی ہے انہیں اتنے ہی تلخ و تیز الفاظ و تمثیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ میں نے اپنے مضامین میں مرکزی خیال دوستی و یگانگت رکھا ہے ۔ اسلئے کہ زیادہ تر مضامین فسادات کے دوران تحریر ہوئے ہیں ۔ اسلئے اِن میں یکجہتی و بھائی چارگی کا درس دینے کی کوشش کی گئی ہے گو کہ عنوانات کے انتخاب میں طنز و تنقیدی انداز پایا جاتا ہے لیکن میں نے حتی الامکان کوشش اس بات کی کی ہے کہ مجرم کو یہ باتیں تلخ گذریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خلوص و اِنکسار کے ساتھ اِصلاح کی بھی کوشش کی ہے خاص کر تکڑے تکڑے اور تختۂ مشق کے عنوانات اور مواد مضمون تلخ اور چبھتے ہوئے ضرور ہیں لیکن اصلاحی بھی ہیں ۔ اُمید کہ قارئین کو پسند آئیں گے اور آئندہ کے لئے میری ہمت افزائی ہوگی ۔

رئیسہ محمد

ایک حیوان نے انسان کا
اُڑایا ہے مذاق

یہ تو ساری کائنات جانتی ہے کہ انسان میں محبت و نفرت کے جذبے کے علاوہ ممتا کا مادّہ بھی پایا جاتا ہے ۔ یہ چیز جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اکثر جانور جیسے بھینس، بلّی، گائے ، بکری وغیرہ اپنے بچوں کو محبت سے چاٹتے ہیں۔ دُم ہلا ہلاکر انہیں اپنے قریب رکھتے ہیں ۔ اِن کے کھانے پینے کا خیال بھی رکھتے ہیں ۔ خود بھوکے رہ جاتے ہیں لیکن اِنہیں کھلادیتے ہیں ۔ اگر انہیں کسی قسم کی تکلیف ہو تو اس کے قریب ٹھیر کر تسلّی دیتے ہیں یا پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے بچّے ان جانوروں کے بچوں کو کوئی اذیّت دیں تو اس جانور کی ماں کو غصّہ آجاتا ہے ۔ وہ کاٹنے دوڑتی ہے ۔ جانوروں کے یہ جذبات اپنے بچّے کی زندگی یعنی زندہ حالت میں دیکھنے میں آتے ہیں لیکن بعض جانوروں میں یہ حِس آج کل کے انسان سے بھی بالاتر ہے خصوصاً کتے میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے ۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ سڑک پر ایک کتّے کا چھوٹا سا بچّہ ایک گاڑی کے نیچے آگیا تھوڑی دیر تک پکارتا رہا اور پھر مرگیا ۔ میں نے غور کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں قریب سے ایک کُتیا جو اسکی ماں تھی فوراً سڑک پر آئی اور دو منٹ تک اس کے قریب ٹھیری رہی پھر اُسکی لاش کو اپنے مُنہ میں دباکر کھینچتی ہوئی سڑک کے بیچ سے تھوڑے فاصلے پر فٹ پاتھ پر ڈالدی اور تقریباً پندرہ منٹ تک اسکا سوگ منانے کے بعد پھر وہاں سے غائب ہوگئی ۔

ایک اور جانور میں بھی ایسی ہی اعلیٰ صفت دیکھنے میں آئی ۔ یہ واقعہ

یُوں ہوا کہ ایک دفعہ ایک بندریا کا بچّہ مرگیا۔ بڑے بڑے درختوں پر بہت سارے بندروں کا بسیرا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک بندر چل بسا ہے اور اُسکی ماں اس سانحہ پر بہت ہی مغموم ہے، سارے بندر درختوں سے نیچے آنے لگے۔ بندریا اپنے بچّے کی لاش کو سامنے ڈالکر اس کے قریب بیٹھی رہی۔ اسی طرح تقریباً تین دن تک سوگ مناتی رہی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نہ صرف ماں بلکہ ساری بندر برادری نے سوگ میں حصّہ لیا۔ باری باری سے وہ سب وہاں آتے تھوڑی دیر تک لاش کے قریب بیٹھتے اور پھر چلے جاتے۔ یہ ہے ان جانوروں کا پُرسہ، انکی تعزیت، اُنکی افسردگی، انکا غم۔ انہیں اپنی برادری سے کتنا اُنس ہے۔ کتنی جلد ہی وہ اپنی لڑائی کو بھُول جاتے ہیں۔ آخر جانور ہی تو ہیں بار بار لڑتے، نوچتے، ایکدوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ایک جاں ہو جاتے ہیں کہ انسان کی عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

آجکل کے اس دَور میں ایک اِنسان دوسرے انسان کی لاش کی حفاظت اور تجہیز و تکفین تو درکنار انہیں زندگی ہی میں راکھ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کبھی خون میں تڑپتا چھوڑ دیا جاتا ہے یا پھر اس کے جسم کو بَم سے پاش پاش کر دیا جاتا ہے پھر اسے بطورِ تماشا دیکھا جاتا ہے۔ جانوروں کا اپنے بچّوں کی موت پر تعزیت کرنا، پُرسہ دینا یا پھر اپنے بچّے کی لاش کی حفاظت کرنا، اسے سڑک پر مَسخ ہونے سے بچانا ایک عجوبہ سا لگا اور عقل دنگ رہ گئی۔ کیوں نہ تعجب ہو وہ تو ہم سے بھی بالاتر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے وہ کام کر دکھائے ہیں جو انسان بھی نہ

کرپاتے ۔ حیرت کی بات تو یہ ہیکہ یہ جانور ایک ساتھ کھاتے ، ایک ساتھ تلاشِ معاش کرتے ہیں اپنے امیر کی بڑائی کو مانتے ہیں ۔ اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں (خاصکر بندر) ۔ ڈر ہے کہ کہیں یہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں ۔ انسان باوجود کہ اشرف المخلوقات ہے اپنی اعلیٰ صفات کو آہستہ آہستہ کھوتا جارہا ہے دل کی کدورتوں ، آپسی نااتفاقیوں اور نفرت کی آگ کی لپیٹ میں آچکا ہے کیا اب یہ ممکن نہیں کہ وہ ان تمام بندشوں کو توڑ کر آزاد ہوجائے اور پھر ایک نیا سفر شروع کردے جسمیں نہ نفرت کی آگ ہو نہ ہی دل کی کدورتیں اور نہ ہی آپسی تفرقہ ۔ خود جیئو اور اوروں کو بھی جینے دو والی بات ہوجائے اور پھر محبت ، خلوص ، بھائی چارگی اور ایکتا کے ساتھ عروج منزل کی طرف گامزن ہوں کہ

نیا سفر ہے نئی منزلیں بُلاتی ہیں
مسافرو روشِ کارواں بدل ڈالو

وہ پیلی جوار

جب انسانوں نے اپنے تئیں سوچ بچار کرنا اپنے عادات و اطوار چال و چلن کی سُدھار پر توجہ ممنوع قرار دے دی تو پرندوں نے یہ خُو ڈال لی اور یوں تبصرہ کرنے لگے ۔ ملاحظہ ہو۔

میناروں کی بلندی سے کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ کبوتری نے یوں ہی ایک نظر طائرانہ ڈال کر کہا تڑکے سے ہی چہل پہل ہو جانی چاہیئے تھی۔!

مندر کے پچھواڑے سے لقّا کبوتر نے ذرا سی گردن نکالی اور تھوڑی دیر پکارنے کے بعد چُپ سَادھ لی۔ یہ سوچ کر کہ شائد ابھی طلوعِ آفتاب میں کچھ اور وقت درکار ہے لیکن اب تو سورج سر پر آچکا ہے۔ پر ماحول پُر اسرار معلوم ہو رہا ہے نہ جانے یہ سنّاٹا کیوں چھا گیا۔ انسان تو انسان چرِند پَرند بھی اپنی بولیاں بند کرلی ہیں۔ بچّوں کا چُلبلانا ہے نہ بَکنا ہے۔ بڑوں نے تو خیر مصروفیت کی بناء پر خاموشی کرلی ہے لیکن سب نے کیوں چُپ سَادھ لی ہے اب ہمارے دانے کا کیا ہوگا؟ خدا جانے۔ کھیت کھَلیان تو خالی پڑے ہیں۔ اب کی بار فصل تو ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ دُور دُور تک ایک دانہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سارے لوگ گھروں میں مقفّل ہوگئے ہیں گویا کہ۔ اَرے بھائی اِن فسادات نے تو ناک میں دَم کر رکھا ہے۔ یہ تو کرفیو کی علامتیں ہیں تب ہی تو کسی نے نہ دانہ یہاں (مندر) ڈالا اور نہ وہاں (مسجد)۔ انہیں ہم سے نفرت سی کیوں ہوگئی ہے۔ ہم ہیر

پسند ۔ ہم تو امن و سلامتی کی بات کرتے ہیں نیکی اور پاکی کی فضا پیدا کرتے ہیں ۔ پھر یہ کیا ہوگیا کہ ہم ہی دانے کو ترسیں ۔ کبوتروں کے جھُنڈ نے سوچ لیا کہ کہیں دُور جاتے ہیں اور پھر وہیں سے کچھ دانہ دُنکا لاکر اپنے بچّوں کو بھی کھِلائیں گے ۔

لیکن کبوتر کے بچّوں نے تو پیلی جوار کی رَٹ لگا رکھی ہے کبوتری نے لاکھ سمجھایا کہ بابا پیلی جوار نہ سہی سفید جوار ہی سہی اب تو کرفیو ہے جو بھی ملے غنیمت سمجھ کر کھالو اور اللہ کا شکر کرو ۔

کبوتر کو بہت غصّہ آیا کہ آخر پڑوسی بچوں نے انہیں یہ عادت کیوں ڈال دی اور اب نہ وہ بچّے ہی دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی جَوار ۔ خیر پھر بھی تلاش کرتے ہیں آخر ان بچّوں نے اپنے ہاتھ کیوں کھینچ رکھے ہیں وہ ہم سے خفا تو نہیں ہیں ہم نے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑا تو پھر وہ ننّھا بچّہ کیوں نہیں آیا جو روزانہ پیلی جوار لاتا اور ہم سب کو پیٹ بھر کھِلاتا ؟ گلی کے لڑکوں نے جب اِن کبوتروں کو دیکھا تو کہنے لگے کبوتر جَا جَا جا وہ گیا اب تو بھی جَا یہ بات تو کبوتروں کی سمجھ میں نہ آئی کہ پہلے تو آ آ کہا کرتے تھے اور اب کہتے ہیں جا جا جا ۔ یہ "آ" اور "جا" کا کوئی چکّر ضرور ہے !

تھوڑی دیر میں ایک فوجی گاڑی آئی اور چند عورتیں روتی ہوئی گاڑی سے اُتریں اور گلی کی طرف چلی گئیں غالباً ان ہی کا وہ بچّہ تھا جو دَنگے میں زخمی ہوگیا اور اب وہ اللہ کو پیارا ہوگیا ہے ۔ کبوتروں نے پیلی جوار کو چھوڑ دوسری طرف کا رُخ کیا کہ گلی کی نکڑّ پر جو اناج کی دُکانیں ہیں وہیں کچھ دانہ مل جائے لیکن

ہائے رے قسمت یہاں تو صرف راکھ کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے اور چند انسانی ہڈیاں
نہ دوکانیں رہیں نہ وہ لوگ ۔ ڈھیر کو کریدنے پر چند سیاہ دانوں کے سوا کچھ نہ ملا
ان ہی دانوں کو غنیمت سمجھکر وہ اپنے آشیانے کی طرف ہولئے ۔ کبوتر کے بچوں
نے جب یہ واقعہ سُنا تو غم و غصے سے انہوں نے مَرن برَت کا اعلان کر دیا ۔
کبوتر اَفسردگی سے سوچنے لگا کہ

اب یہ دیش ہوا بیگانہ

پھر ٹھوکر کھائی سنبھلتے سنبھلتے

خواہش تو یہی رہی کہ ہمیشہ قدم سے قدم ملاکر چلیں لیکن طوفان نے آگھیرا۔ نسیم سحری نے بے رُخی کی، گُل نے مُسکان چھوڑ دی، چندن نے سرد مُہری کی، لالہ نے سیاہی بکھیری، پتّوں نے تھرکنا چھوڑا۔ سارا چمن تتّر بتّر نہ وہ پہلی سی شادابی نہ شگفتگی نہ چُستی نہ پُھرتی بہار نے پتھّر برسائے، کھیتوں نے زہر اُگلا، کھلیان ریگستاں بنے، سبزہ زرد ہوا، خون سفید ہوا، ندّیوں کے سوتے سوکھے، جھرنوں نے چیخنا سیکھا، مٹّی نے خون سے پیاس بجھائی، پرندوں نے چہچہانا بھولا اور گِدھوں نے بھوک مٹائی۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیا ہمارے اَوسان ٹھیک نہیں؟ تو پھر ہم نے یہ کیوں دیکھا؟ ہم ہی نے اپنے طور طریقے بدل دیئے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلُشن کو تاراج کیا۔ باغبانوں نے خود شگفتہ کلیوں کو رَوند ڈالا چمن کی رنگینی کو ماند کیا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے ان یگانگت کے پودوں کو بُویا، انہیں سینچا صدیوں اُنکی رکھوالی کی اور تناور درخت بنائے اور پھر خود ہی اِنکی ڈالیوں کو توڑ مَروڑ کر جلانے لگے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جِن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

بہاروں نے پَر لگائے اور خزاں نے آدبوچا ہم ہی نے اپنی تہذیب کے پرخچے اُڑائے، اپنے اتحاد کو توڑا، اپنی قوّت کو تقسیم کیا، اپنے ہی صحن میں کلنٹے بوئے۔ اپنی ڈگر (انسانیت) کو چھوڑ کر اندھیری گہری کھائی میں پڑیں تو نتیجہ بُرا

ہی ہوگا، چمن ویرانہ ہی بنے ۔اِس گلشن کی رَعنائیوں کو آپسی تفرقے نے دھکّا دیا ورنہ نہ گرتے نہ سنبھلتے بَس چلتے ہی جاتے اور مَوج مَناتے لہراتے ۔

پھر بھی ہمارے ضمیر کو زنگ نہیں لگا حالانکہ خزاں کے جھکّڑ نے لڑکھڑا دیا ہے ہم اپنی قوّتِ ارادی کو مات نہ ہونے دیں گے ،اپنے چمن کی پھر سے آبیاری کریں گے ، ہمارا اتّحاد ضرور رنگ لائے گا اور ہم ماضی کی بُرائیوں کو چھوڑ شاندار پُرامن پرُ خلوص پُرنور مستقبل کی طرف رَواں دَواں ہوجائیں گے اور ہمارے اس تہذیبی سرمایہ کو لُٹنے نہ دیں گے کہ یہی تو ہماری پُونجی ہے جسے صدیوں سے ہم نے سنبھال رکھا ہے ۔

باپو کا عَزم ،جواہر کی جَولانیاں ،اِندرا کا بھرم پُکار رہا ہے کہ چھوڑ دو ان تَفرقوں کو اور ایک ہوجاؤ ٹھوکر کی پروا نہ کرو کہ انسان ٹھوکر کھاکر ہی سنبھلتا ہے ۔

تختۂ مشق

یُوں تو کسی بھی فن میں مہارت ۔ کے لئے خاصی مشق کی ضرورت ہوتی ہے مشق کے بغیر فنون کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ۔ مہارت کے لئے مشق کو جاری رکھنا بھی بے حد ضروری ہے یعنی اسکا استعمال بھی رہے ورنہ جیسا کہ مشین کو استعمال نہ کرنے سے زنگ آجاتا ہے اور آہستہ آہستہ ناکارہ ہوجاتی ہے بالکل اسی طرح انسان کو بھی اپنے فن کی مشق کی ضرورت ہے ۔ مشقیں کئی طرح کی ہوتی ہیں ۔ لفظ مشق کے ساتھ ہی ہمارا ذہن بچپن کی خوشنویسی اور خطاطی کی مشق کی طرف منعطف ہوجاتا ہے یا پھر ریاضی کی مشق اسی طرح فنونِ لطیفہ کی بھی مشقیں ہوتی ہیں ۔ قدیم زمانے میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی ۔ بچپن سے ہی انکی ایسی تربیت کی جاتی تھی کہ وہ اپنے فن کی روزانہ مشق کرتے تھے اور پھر اس میں ماہر و کامل ہوجاتے تھے ۔ یہی نہیں شاہوں نے بھی مشقیں کی ہیں جیسے کہ تیر اندازی کی مشق، گھڑسواری کی مشق، سپاہ گری کی مشق، شکار کی مشق، تلوار چلانے کی مشق، توپ داغنے کی مشق، غرض مشقیں کئی طرح کی ہوتی تھیں امیر و غریب سب ہی اپنے ہنر میں کمال پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن باوجود اتنی مشقوں کے کسی قسم کا جانی و مالی نقصان نہ امراء و شاہوں کی طرف سے رعایا کو پہنچتا اور نہ ہی رعایا کی جانب سے اپنے ہم وطنوں اور اپنے ہمسایہ لوگوں کو ۔ اب تو حالات کچھ اور ہی ہوگئے ہیں خصومت،

عداوت، نفرت، تفرقہ اور دشمنی کے بدلوں کے ساتھ ساتھ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مشق کا وار ان محتاج غریب، نحیف، ناتواں، کمزور لوگوں پر کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو وار کی کوئی مزاحمت کی سکت رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی مشّاق کا جواب ہی دے پاتے ہیں وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہیں کہ وہ مدد کے لئے آواز دینے کے بھی لائق نہیں۔ اسلئے کہ بلند آواز کے لئے بھی قوّت درکار ہے اور قوّت کے لئے غذا، ان غریبوں کی آواز نکلنے کے لئے کم از کم انہیں اپنی بھیک سے اتنا ہی کچھ حاصل ہوجاتا کہ وہ اپنا پیٹ بھر کر اس لائق بن جاتے کہ اس حملے کی کسی کو اطلاع ہی دے سکیں یا پھر اسکی مانگ کو پورا کرنے کا حوصلہ ہی پیدا کر سکیں یا پھر اپنے تھکے ہوئے جسم کو اتنا چُست کر سکیں کہ وہ دن بھر مٹّی کے تودے اور وزنی بوجھ کو اُٹھاتے ہوئے بھی مشاق کے چمکیلے وار کا بوجھ سہہ سکیں اور اپنی سخت و نوکیلی ہڈیوں سے ہی اس دھار کے اُبھار کو سمیٹ سکیں اور اپنی مشقّت کو اس پر وار سکیں اور اپنی کُٹیا کو رَونق بخشیں۔ ایسے بے دَرد، بے جا، بے حِس انسانی واروں کو جن کا نہ کوئی مقصد و مدّعا ہو نہ جیت نہ ہار نہ آس تو پھر ایسے انسانوں کو نشانہ بنانے سے مقصد؟ انہیں تختہ مشق نہ سمجھیں تو پھر کیا سمجھیں؟

کاروانِ تارکین

چاہے وہ پرندوں کے آشیانے ہوں یا جانوروں کی چراگاہیں، مٹی کے گھروندے ہوں یا عالیشان کوٹھیاں سب کی رَونق اسکی آبادی پر منحصر ہے ویرانہ تو کسی کو بھی راس نہ آئے گو کہ شور شرابا اکثر پسند نہیں آتا لیکن ویرانہ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ کسی مقام کا آباد رہنا اس ماحول کی تنظیم اور بھائی چارگی کا ضامن ہے۔ جان و مال کی سلامتی اور عوام کی خوشحالی بَسیرے کو بڑھاوا دیتی ہے۔ امن اور شانتی کا پُر سکون ماحول خوشیوں میں اضافہ کرتا ہے اور یہی مقامی افراد کے کردار کا مظہر ہوتا ہے اور ایسی فضا میں تندرست و تنو مند معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔

آبادی اور ویرانہ دونوں آپس میں متضاد ہیں ایک خوشی چہک لہک اور قہقہہ کی غمازی کرتا ہے تو دوسرا غم درد اور خاموش اور سِسک کی۔ جس نے پہلی چیز حاصل کی وہ خوش قسمت ثابت ہوگیا لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب ہی کی قسمت میں خوشیاں ہوں۔ زندگی میں دکھ، درد، غم سب ہی کا سامنا ہوتا ہے اور اِسی کا نام زندگی ہے۔

خوشی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

لیکن اگر مصیبتیں ، غم اور بربادی کسی کی عنایت ہو تو پھر اس کو برداشت کرنے کی بجائے مقابلہ کیا جائے اس لئے کہ کمزور کا جینا محال ہے ۔

Struggle For Existance
&
Survival of the Fittest

جو حالات کا سامنا کر لے اور انہیں برداشت کرے یا پھر اُنکا مقابلہ کر لے اسی کی جیت ہوگی ۔ ظلم و بَربَریت اگر قوّتِ برداشت سے باہر ہو تو پھر نقلِ مقام ہی اسکا ایک واحد ذریعہ رہ جاتا ہے ۔ ہمارے مذاہب نے ہمیں بُرائی سے بچنے اور بُرے مقامات اور نقصان پہنچانے والے کی قُربَت سے منع کیا ہے ۔ ہمارے سماج ہی نے معاشرے کے ساتھ ساتھ مخصوص مقامات کو بھی خراب بنادیا ہے ۔ قدرتی طور پر نہ تو کوئی سماج ہی بُرا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مقام ، اسکی اچھائی اور برائی کا انحصار مکین پر ہے مکان تو بہر صورت ایک مقام ہے گو کہ دونوں کا قریبی تعلق ہے لیکن مکین کو اگر بے مکاں کردیا جائے تو پھر کوئی نیا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔

حالیہ فسادات نے کئی افراد کو مکانات کے تخلیہ پر مجبور کردیا ۔ وہ خوشنما گھر جنکی فضائیں ہزارہا بار بقعۂ نُور بنیں ، خوشیوں کے نقّارے بجے ، جن کی مٹّی کی خوشبو نے فرحتِ قلب عطا کی اور جس کی تَراوٹ میں دوستی و خلوص کی گھُلاوٹ تھی ، جن کے صحن پھُولوں کی بھِینی بھِینی خوشبُو سے معطّر تھے اور ننّھے

ننھے بچوں کے قدموں کے بوسوں سے دھرتی مچل اُٹھتی تھی اب ریگستانی خاردار جھاڑی کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ تنگ نظری نے خوشیوں کو محدود کردیا۔ احساسِ کمتری نے مجبور کردیا۔ بَرتر کے حوصلے بڑھے اور بَربادی کے طُوفان کھڑے ہوئے۔ اِنسانیت نے اپنا بُوریا سنبھال شانتی کی سمت روانگی کی، مظلوموں نے سامانِ زندگی چھوڑ اپنی راہ لی۔ حَیوانیت نے مقام کیا۔ اِن بَربادیوں کا کون ذمّہ دار ہے۔ انہوں نے خود نہ ہی کوئی بربادی کو دعوت دی اور نہ ہی خواہ مخواہ کاروان میں شمولیت کی وہ تو اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اسی فضاء میں لینا چاہتے تھے ساری زندگی جس ماحول میں گذاریں بھلا اس ماحول سے کیسے محبت نہ ہوگی۔ وہاں کے لوگ وہاں کی خوشیاں وہاں کی گلیاں وہاں کے بازار کونسا مقام ایسا ہوگا جسے حافظہ بُھلا سکے۔ رہ۔ رہ۔ کر انہیں اس ماحول کی یاد اور اپنے آبائی مکان کی فضا تڑپا دیتی ہوگی۔ ان ساری باتوں کو اپنے حافظہ سے کیسے مٹایا جاسکتا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یَارب
چھین لے مجھ سے حَافظہ میرا

اے کاش کہ مستقبل قریب میں پھر سے وہ خوشیاں عُود کر آئیں پھر سے آنگن سجیں پھولوں کی خوشبو مہکے خوشیوں کے شادیانے بجیں اور ایک نئے دَور کا آغاز ہو کہ

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیَار میں

کوئی بیگانہ نہیں

کرۂ ارض کی ساری مخلوق کا آپس میں ایک اَٹوٹ رشتہ ہے اور وہ ہے اِنسانیت کا رشتہ۔ باوجود یہ کہ دُنیا ایک ہی ہے مختلف اقوام نے اپنے علٰحدہ علٰحدہ خطّے بنائے اور اُن پر اپنی اپنی حکومتیں چلائیں۔ حکومتوں کے نئے نئے طرز اپنائے اور نئے نئے قانون بنائے ان سب میں جمہوریہ طرز حکومت کو اکثریت نے قبول کیا۔ بھارت نے بھی جمہور بننا پسند کیا اور آخر کار 15 اگسٹ 1947ء کی شب اسے حاصل کرلیا۔ اب اس جمہوریت کی بقا کے لئے سب سے بڑی اہمیت سیکولر ذہنیت کے ساتھ ہماری قوم کی ایکتا اور یکجہتی ہے جو ہمارے ملک کی ترقی کی ضامن ہے۔

جذبۂ قومیت نہ صرف اتحّاد اور یکجہتی کو فروغ دیتا ہے بلکہ اس سے زبان اور کلچر کو بھی فروغ ہوتا ہے اور اسی کے باعث قومیں ترقی کر پاتی ہیں۔ اس سے ہمارے ملک و سماج کا سَر بلند رہتا ہے اور ملک ہر میدان میں ترقی کرتا جاتا ہے اپنے ملک کو معاشی طور پر خود مُکتفی بنانے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا انحصار سماج کے تمام افراد کے کندھوں پر ہے۔ افراد ہی اس اہم رول کو انجام دے سکتے ہیں۔ ہم سب اپنے سماج و معاشرے کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی جمہوریت کے محافظ بھی ہیں اس لئے کہ فرد سماج کی اکائی ہوتا ہے اور افراد کے اتحاد و اتفاق پر ہی سماج اور قوم کی ترقی ممکن ہے

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا سِتارہ

اتحّاد کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی توانائی کو دُنیا کی کوئی قوّت بھی توڑ نہیں سکتی ۔ ہمارے قومی وِرثہ کی حفاظت ہماری قوتِ بازو میں ہے اس خزانے کی جتنی بھی حفاظت کی جائے کم ہے ۔ ہماری تہذیب ہمارا تمدّن و کلچر تب ہی محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ملک میں بھائی چارگی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی باقی رہے ۔

ہم ہندوستانی ساری دنیا میں امن کا پرچم لہرانے والے اپنے ملک کی یکجہتی کے لئے مرمٹیں اور اپنے ملک کی آن بان قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں اور آپسی نااتفاقی اور تہذیب و کلچر اور زبان کے نام پر اپنے آپ کو قوم سے الگ نہ سمجھیں اور اپنے دل و دماغ پر اس بات کو نقش کرلیں کہ ہم سب ایک ہیں ایک ہی رہیں گے اور متحّد ہوکر اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں گے ۔ اگر ہم سب ایک جان ہوجائیں اور اپنے ہم وطنوں سے اپنائیت کا سلوک کریں تو وہ دن دور نہیں کہ بھارت کے بھاگیہ کا ستارہ ساری دنیا کو بقعۂ نوُر بنادے ۔ یہ سب اِسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم سب ایک ہوجائیں اور ہم میں کوئی بیگانہ نہ رہے ۔

تفریحِ طبع

بچّے تماش بینی کے شوقین ہوتے ہیں۔ یہ تماش بینی انکے تجربات میں اضافہ کرتی ہے اور اس مشاہدے سے اُن کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اسلئے بعض طریقۂ تعلیم میں کھیل اور تفریح کے ذریعہ علم دیا جاتا ہے جو سُود مند بھی ہے۔ بچّے تو کیا بڑوں اور بُوڑھوں کے لئے بھی تفریحی سامان اور اوقات گذاری کے لئے مشاغل ضروری ہیں۔ مختلف طبقات کے لوگ عُمر اور صنف کے لحاظ سے اپنے اپنے مشاغل اور مصروفیات کی طرف توجہ دیتے ہیں ان تفریحات اور مشاغل سے وقت بڑی آسانی سے کٹ جاتا ہے اور تماش بینی کا تو لُطف ہی اور ہوتا ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں تفریح طبع کے لئے تماشوں کا ہی انتخاب کیا تھا مثلاً ریچھ کا تماشا، بندر کا تماشا، سانپ کا تماشا، بچھّو کا تماشا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اپنے ذوق کی بات ہے ہر ایک اپنی طبعیت کے لحاظ سے تفریح کرتا ہے، کھلاڑی کھیل کے مَیدان میں، سیاست داں سیاست میں، مصوّر رنگوں کی دنیا میں، ادیب اَدب میں۔ بہرحال تفریح کے بیسوں طریقے ہیں بیسوں میدان ہیں اور آج کل کے اس سائنس اور ٹکنالوجی کے ماحول میں نئے نئے انداز پائے جاتے ہیں۔ اپنی تو اپنی دوسروں کی جان بھی جوکھم میں ڈال کر تفریح کی جاتی ہے اور پھر اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور ایک تماشے کا لُطف اُٹھایا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں چوُں کہ جہالت کا دَوَر دَورہ تھا اور زندگی انسانیت کے اَقدار سے بہت دُور تھی اپنے اور دوسرے کے دَرد اور تکلیف میں کافی فرق پایا جاتا تھا اس لئے یونانی

نسل کے بعض قبیلوں میں اس قسم کے بعض تفریحی کھیل پائے گئے ہیں جن میں انسانوں کو جسمانی ایذا پہنچا کر اور ان کو تڑپتا دیکھ کر لوگ محظوظ ہوتے تھے لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور زندگی کے وہ طور طریقے بھی نہیں رہے، جہالت دُور ہوتی جارہی ہے، اعلیٰ تعلیم کے وسائل پیدا ہوگئے ہیں، انسانیت کی تربیت دی جارہی ہے، مختلف علوم سے سماج سُدھار اور معاشرے کو بہتر بنانے کے طریقے بتلائے جارہے ہیں، اتّفاق اور اتّحاد کے اَسباق پڑھائے جاتے ہیں، سود و زیاں کا فرق بتایا جاتا ہے، زندگی اور موت کی خوبیاں اور خرابیاں سمجھائی جاتی ہیں۔ پھر اِنسان کی اس تفریح میں وہ کونسا جَذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ تفریح کے لئے انسانی جانوں کا سودا ہو یہ تو خدا ہی جانے نہ تو سود و زیاں کا لحاظ نہ تو کوئی سیاسی یا معاشی مقصد ہی ہے بھولے بھالے اِنسانوں کو جو اپنے دلوں میں ہزاروں ارمان لئے زندگی کی مسرّتوں سے بھرپور اس دنیا میں چند اور دن گذارنے کے خواہاں ہوں اور جنہوں نے اپنی عُمر کی چند بہاریں بھی نہ دیکھی ہوں انہیں بموں کے ذریعہ تماشا بنادیا جاتا ہے ایک قیامت کا سماں برپا ہوجاتا ہے اور پھر تماش بینی ہوتی ہے۔ مخلوق کی ان شیطانی حرکات کو دیکھ کر اِنسان تو اِنسان خالق بھی حیران رہ جاتا ہوگا۔ اگر یہ تمام کسی سیاسی یا مَعاشی مقصد کے تحت کارفرما ہو تو پھر اسے بغیر اشتعال کے پُرامن طریقہ پر جمہوری طرز سے کیوں نہ سُلجھایا جائے۔

اپنے ہم وطنوں سے مصلحت اور سمجھوتے کے ذریعہ سب ایک دل اور یک جا ہوکر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈیں بجائے اسکے کہ بے دِلی سے پیش آئیں۔

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دِلی ہم رواں سے ہم

نقلِ مقام

اکثر جاندار تبدیلی، آب و ہوا کی غرض سے مقام کو تبدیل کر دیتے ہیں اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا بستے ہیں یا پھر ناسازگار حالات کی بنا پر بھی تبدیلی مقام پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اکثر اوقات اپنی طبعیت و مزاج کے لحاظ سے مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے تاکہ اس تبدیلی سے صحت و تندرستی پر اچھا اثر پڑے۔

خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنے ماحول اور مقام کا ضرور اثر لیتا ہے چونکہ یہ بات انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے اس لئے بچّے اس کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اکثر اسکے مثبت اثرات بھی پائے گئے ہیں بشرطیکہ کسی خاص مقصد و مدّعا کے تحت تبدیلی مقام کی جائے۔ اکثر اونچے طبقے کے لوگ تبدیلی آب و ہو کی غرض سے اُوٹی، دار جلنگ، کشمیر یا پھر مغربی ممالک کے کسی خوشگوار موسم خطّے میں وقت گذار کر وطن واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ تو زندہ انسانوں کی باتیں ہوئیں۔ مُردہ انسانوں کا بھی تو نقلِ مقام کر دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مُردہ کو نقلِ مقام کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا یہ نقلِ مقام تبدیلی آب و ہوا ہے؟ یا پھر اس نقلِ مقام سے مُردہ زندہ ہو جا سکتا ہے؟ زندہ تو نہیں ہو سکتا البتہ اسکو مُردہ کر دینے کا جرم چھپانے کی ناکام کوشش ہو سکتی ہے۔ او مقامات کا انتخاب بھی اسی نوعیت سے کیا جاتا ہے مثلاً گندی نالیاں، گھرے

کنوئیں، تالاب، خار دار جھاڑیاں، گھنے جنگلات یا پھر زیرِ زمین مقامات پر جسم کے مختلف اعضا کو علاحدہ علاحدہ مختلف ڈھنگ سے مٹّی میں چھپا کر۔

کیا ایسا جرم چھُپ سکتا ہے ؟ جسکی کے عدل و انصاف کے دوّر میں پاداش ہو۔ کیا مُجرم کو سزا سے فرار مل سکتی ہے ؟ بے گناہوں کو ختم کرکے ان کی نعش کو مسخ کرکے اپنے گناہِ عظیم کو چھپانے کے لئے مقتول کی لاش کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبدیل کردینے سے کیا جرم و گناہ پر پردہ پڑسکتا ہے ؟ کیا یہ ناقص تدابیر کارگر ہوسکتی ہیں ؟ کیا عدل و عادل کے ہاتھ مجرم تک نہیں پہنچ سکتے ؟ تو پھر انسان کیوں اس قسم کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے کیا وہ جرم کو کھیل سمجھتا ہے ؟ اگر وہ اسکو ایک کھیل یا تماشا سمجھتا ہے تو پھر اس سے پردہ داری کی ضرورت کیوں ؟

غلطی تو انسان سے ہی ہوتی ہے لیکن ایسی غلطیوں کے اِزالے کے لئے سزا بھی اتنی سخت ہو اگر انسان اپنی جنونی کیفیت اور بدلے اور نفرت کی آگ پر ایک لمحے کے لئے قابو پالے تو بہتر ہے اور یہ سمجھ لے کہ بہر صورت عدالت کا سامنا کرنا ہوگا تو اپنی ذہنی اُلجھن کا حل اسے کسی نہ کسی طرح مل سکتا ہے بشرطیکہ اپنے فیصلے سے چند لمحے پہلے سوچ بچار کرلے اور اپنی اِن مجرمانہ تدابیر سے پرے ہٹے کہ ان تدابیر کا کوئی حاصل نہیں۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

شانِ امن

جنگ وجدل کے احساس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن شاہانہ جاہ وجلال کی طرف منعطف ہو جاتا ہے اس لئے کہ شاہوں نے ہمیشہ ہی اپنے رعب و دبدبے کے لئے بڑے بڑے لشکروں کا سہارا لیا اور اکثر سلاطین نے اپنی سلطنت کے حدود بڑھانے کی کوششیں کی۔ زمانۂ قدیم سے یہی روایت چلی آرہی ہے لیکن ایسی حکومتیں جن کی بنیاد جنگ و جدل پر ہی ہو وہ سلطنتیں زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکیں۔ اب اگر اکبر اعظم اور اشوک اعظم کی ہی مثال لے لیں تو پتہ چلے گا کہ دونوں نے جب شانتی کا راستہ اختیار کیا تب ہی جاکر تاریخ نے انہیں اونچا مقام دیا۔ اس کے باوجود یہی ہوتا رہا کہ جس بادشاہ کا لشکر بڑا ہوتا جس کی جنگی قوت زیادہ ہوتی وہ بڑا مانا جاتا اور چھوٹی ریاستیں اس کے چھوٹے راجا اس کے اطاعت گذار رہا کرتے تھے یا ان کی ریاست پر قبضہ کرلیا جاتا۔ گویا کہ سمندر کی بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کرلیا۔ غرض وہ بھی اپنی حفاظت اور سلامتی سلطنت کے لئے افواج کا سہارا لیتے تھے۔ اعلیٰ ہتھیار بہترین فوجی تربیت باعثِ فخر سمجھی جاتی تھیں۔ آج بھی یہی باتیں دکھائی دیتی ہیں فرق صرف لشکروں کے ساتھ زہریلے ہتھیاروں کا اضافہ ہے اور نئے نئے طریقے استعمال جن سے زیادہ سے زیادہ دیر پا جانی ومالی نقصان ہو اور ان کی مدد سے جلد از جلد سبقت لینے کی کوشش کی جائے۔ کامیابی کی یہ کوششیں بعض دفعہ فوجی معاملات کو شخصیات سے منسلک کردیتی ہیں۔

بہرحال ہر اقتدار نے دفاع پر زور دیا ہے۔ اسکو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششیں بھی کیں۔ ہماری تاریخ نے افواج کو ملک کے اندرونی بِزاج اور بیرونی حملے سے بچاؤ کا ذریعہ بنایا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امن کی بقا کے لئے صرف افواج کی سخت ضرورت ہے لیکن فوجی قوت سے امن کی بقا اور امن کی شان کو دھکا بھی پہنچتا ہے۔ امن کی شان انوکھی ہے۔ چین اور سکون اسی کی آغوش میں پروان چڑھتے ہیں۔ ہر کام کی اِبتدا اور اِنتہا کے لئے چین، سکون و شانتی کی ضرورت ہے چاہے وہ ایک معصوم شیرخوار کے پلنے کی ڈور ہو، یا کہ بندوق کی نالی، دونوں ہی کے برتنے میں اتنی ہی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ امن وامان وشانتی کو کس طرح حاصل کیا جائے کیا حصولِ امن کے لئے ان زہریلے تباہ کن ہتھیار کے سوا اور کوئی ہتھیار ہیں؟ کوئی دوسرا پُرسکون راستہ نہیں؟

اگر جنگ وجدل کے اس گہرے کنوئیں میں جھانکا جائے تو ہمیں اس سے بھی ہیں زیادہ قوی تیز دھار پُراثر ہتھیار ملیں گے جن کی طرف ہم نے زیادہ توجہ نہیں دی جو کہ اِن دھاتی اَوزار نما ہتھیاروں سے بالکلیہ مختلف ہیں اور جنھیں عام زبان میں قلم اور زبان کہا جاتا ہے ایک ہے لکڑی کا ٹکڑا دوسرا گوشت کا لوتھڑا لیکن یہی چُکاتے ہیں جھگڑا۔

وہ بھی ہیں آدمی

ویسے جراثیم کُش دَواؤں نے تو بڑی حد تک پودوں اور انسانوں کو بیماریوں اور تکالیف سے نجات دلانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور ہم موجودہ دَور میں اس کے دُور رَس نتائج بھی دیکھ رہے ہیں۔ اچھی Strong دواؤں کے استعمال سے خراب سے خراب جراثیم بھی ختم ہوجاتے ہیں اور اس طرح اُن کا صفایا کیا جاسکتا ہے کہ پودے ہوں کہ انسان دونوں کو ہی کوئی نقصان نہ پہنچے اور صرف اَثر اس دوا کا ان جراثیم کے حدود میں ہی ہو لیکن یہ جراثیم (کیڑے) اور دوائیں تو قدرتی ہیں۔ ان کے وسائل قدرتی ہیں خواہ وہ دوا کا جزُ ہو کہ کیڑوں کا دونوں ہی کی بِنا قدرتی ہے لیکن ہمارے سماج نے تو اپنے افراد کو بھی کیڑوں میں تبدیل کردیا ہے۔ مثلاً کالے اور گندے کیڑے، موٹے اور بدنما کیڑے جنھیں انسان ہوتے ہوئے بھی انسان سے دُور رکھا جائے تو پھر اسکا سہرا کس کے سر جائے؟

خدا نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کا رُتبہ عطا کردیا اور اسکو حیوانات و نباتات و حشرات الارض بلکہ اپنی ساری مخلوق میں سب سے بالا تر قرار دیا۔ لیکن یہ کیا کہ! ہم ہی نے اُنھیں گندی نالی کی کیڑے سمجھا اور انہیں گندگی کے حدود میں رکھا کہ گندگی پھیلنے نہ پائے اور ایک ہی مقام پر رہے تاکہ اسکے مُضر اثرات نہ ہوں۔ اس سماجی بائیکاٹ کا کون ذمہ دار ہے؟

کیا وہ انسان نہیں ؟ کیا انہیں جینے کا حق نہیں ؟ کیا اُن کی رَگوں میں خون نہیں ؟ کیا ان کے سینوں میں دل نہیں ؟ کیا انکے کوئی اَرماں نہیں ؟ کیا ان کے خاندان نہیں ؟ کیا ان کی بہو بیٹیاں نہیں ؟ کیا ان کی عزّت و ناموس نہیں ؟ کیا انہیں غیرت و حَیا نہیں ؟ کیا انہیں تن ڈھانکنے کی احتیاج نہیں ؟ کیا ہمارے خدا نے ہی انہیں پیدا نہیں کیا ؟ تو پھر یہ تفرقہ کیوں ؟ جب کہ قدرت نے ہر ایک کو مساوی حقوق دیے ہیں تو پھر وہ کیوں نہیں عام انسانوں کی طرح زندگی گذار سکیں ؟

انہیں مساوی حقوق تو درکنار گندی نالیوں میں ہی سہی سانس لینے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی اور بجائے اسکے انہیں مَسل کر کچل کر گہرے پانی میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ جب وہ دوبارہ جنم لیں تو ان میں اور بھی زیادہ پاکی آجائے اسکے برعکس اس پانی سے ان میں اور بھی زیادہ تر و تازگی اور قوّت کے امکانات ہیں۔

جب صبر کا پیمانہ لَبریز ہوجاتا ہے تو ساری دنیا کی توانائیاں عُود کر آجاتی ہیں اور پھر صبر اپنی قوّت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ویسے صَبر کا پھل تو میٹھا ہی ہوتا ہے اور خاص کر جب کہ یہ مٹھاس مقوّی ہوجائے اور ہم کو یہ سمجھنے پر مجبور کردے کہ وہ بھی آدمی ہی ہیں کوئی کیڑے پتنگے یا حیوان نہیں۔

تضحیکِ روزگار

ذریعہ معاش کے ہزاروں ڈھنگ ہیں فُقرا سے وزرا تک ہم نے نئے نئے ڈھنگ سے لوگوں کو اپنا روز گار مہیا کرتے دیکھا ہے۔ فقیروں نے زمانہ قدیم سے ہی بھیک مانگ کر فقیری کا پیالہ پی کر گھر گھر سوال کرکے اپنا پیٹ پالا۔ ان میں سے بعض تو ہٹے کٹے نوجوان بھی پائے گئے لیکن چونکہ وہ فقیری کا پیالہ پئے ہوئے ہیں لہذا سوال کرنا ان کا کام ہے اور اسی کو انہوں نے ذریعۂ معاش بنایا انہیں جمہوریت میں پوری آزادی حاصل ہے۔ یہ تو رہے فقیر، کئی دوسرے لوگ بھی عجیب و غریب طریقے اپنائے ہوئے ہیں جیسا کہ انسانی جانوں سے کھیلنا، معصوم بچوں کا دھندہ کرنا، انسانی اعضا کو فروخت کرنا، لنگڑے لولے کرکے ان بچوں سے بھیک منگوانا، چوری کرنا، راستے میں بھلے لوگوں کو ٹھگ لینا، چلتے چلتے ہاتھ کی صفائی، کرائے کی لوٹ مار، خون بیچنا، کبھی غریب لڑکیوں کی شادی کے بہانے اور کبھی کسی مقدس مقام کو جانے کے بہانے جھوٹ موٹ پیسہ جمع کرنا۔ بعض وقت تو یہاں تک بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مُردہ جسم کو غسل دیتے وقت اس کے قیمتی کپڑے یا زیور حاصل کرلئے جاتے ہیں اور پھر کفن پر نظر رکھی جاتی ہے اور آخر کار کفن بھی جو کہ صاف ستھرا ہو اور صرف چند گھنٹوں کا ہی ہو چرا لیا جاتا ہے۔ یہ تو رہی کپڑے زر زیور اور مال کی بات۔ غالبا اسی کی انتہا ہے کہ یہی بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گئی کہ حادثے کے مارے انسان کی گلی ہوئی لاش کو بھی ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی گئی اور اس سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ کم از کم اس

بہانے اس لاش کی تدفین کے لئے جو رقم حکومت سے مل رہی ہے اس کو حاصل کرلیا جائے اور پھر اس کو گِدھوں کے حوالے کردیا جائے تا کہ مفت میں کام انجام پاجائے اور پھر جائز وارث بن کر مزید رقم حاصل ہو غرض انسان نے اپنی عزّت و غیرت کو اس حد تک گرادیا ہے کہ وہ ہر کام کر گذرا جس سے کہ انسانیت داغدار ہو۔

آخر اِن انسانوں نے وہ کون سے جذبے کے تحت اِس کار نامے کو انجام دیا کیا انہوں نے اپنے ضمیر سے کبھی یہ پوچھا بھی کہ آخر اس طرح حاصل کی ہوئی آمدنی ان کے کس کام آئے گی آخر اُن کو کونسی ایسی مجبوری تھی جس نے اسے اس ذریعہ معاش کو اپنانے پر اُکسایا۔ یہاں تک کہ چرند و پرند نے بھی اپنی لاشوں کی تک حفاظت کی اور اسے کسی محفوظ مقام پر رکھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اس اشرف المخلوقات کی سمجھ کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسی حرکات کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ کیا آدمی اتنا حقیر ہوگیا ہے کہ وہ تھوڑے سے مال وزر کے لئے انسانیت کو نیلام کردے اُنس و محبّت کے جذبے کو بالائے طاق رکھدے۔

اس واقعہ سے ہمارے ذہنوں میں کئی سوالات اُٹھتے ہیں ؟ کیا یہ ہمارے معاشرے کی خرابی ہے ؟ کیا یہ اِنفرادی ماحول کی اُپج ہے ؟ کیا یہ خاندانی تربیت کا اثر ہے ؟ کیا یہ درس گاہوں کا درس ہے ؟ کیا یہ احساسِ کم تری ہے ؟ کیا یہ بگڑے ضمیر کی آواز ہے ؟ یا یہ زمانے سے سمجھوتہ تو نہیں ؟ کیا یہ معیشت کا بحران ہے ؟ کیا یہ نفس پرستی ہے ؟ کیا یہ مادّیت پرستی ہے ؟ فہم و فراست کا فقدان تو نہیں ؟

ان تمام سوالات کے جوابات ضمیر کی تربیت میں پنہاں ہیں اور اس کی ذمہ داری سماج کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے تئیں اپنے ساتھیوں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھیں اور اُسے بُرائیوں سے روکیں تاکہ پھر ایسے جرائم کا اعادہ ہونے نہ پائے اس لئے کہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

جبلّتِ انسانی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ ہی اچھی اور جاذبِ نظر چیز کی طرف بڑھتا اس کو حاصل کر لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور آخر اس کو پالیتا ہے۔ اچھائی اور بُرائی کا یہ امتیاز اس کو اپنے ورثہ سے ملتا ہے اس کی ہر حرکت کے پیچھے اس کا ضمیر کارفرما ہوتا ہے۔

جذبات و جنونی حالت میں بھی اس کو اس بات پر یقین رکھنا کہ سب سے پہلے ہم انسان ہیں اور پھر ہندو یا مسلمان یا سکھ یا عیسائی یہی ہے انسانی ضمیر کا عروج۔ ہر فرد اپنے ضمیر کی آواز پر چلتا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ سب سے پہلے ضمیر کی تربیت ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ضمیر کیا چیز ہے؟ یہ وہی چیز ہے جو ہمارے اندر کے انسان کو کسی کام کے لئے راغب کرتی ہے اور پھر انسان وہی کچھ کر گذرتا ہے جو کہ اس کا ضمیر کہتا ہے۔ کیا اس ضمیر کی تربیت ممکن ہے؟ کیا اس ضمیر کو اچھے کام کے لئے بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟ کیا ہر ضمیر برائی کی طرف راغب ہوتا ہے؟ کیا ہماری تربیت میں ضمیر کی تربیت بھی شامل ہے؟ کیا ضمیر کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے؟ کیا ایک ضمیر دوسرے ضمیر کا اثر قبول کرتا ہے؟ کیا ضمیروں کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے؟ ایسے ہزاروں سوالات ہمارے ذہن میں اُبھرتے ہیں ان سارے سوالوں کے جوابات کے لئے ہمیں نئے سرے سے اپنی شخصیت کا جائزہ لینا پڑے گا کہ ہم سے کون کون سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور کیا ہماری تربیت میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی اگر ہر انسان اس طرح سے اپنے

ضمیر کی خود ہی تربیت کر لے اور اسکو جنجھوڑ کر یہ سمجھا دے کہ برائی کی طرف نہ جُھکے اس لئے کہ یہ انسانیت سے کھیلتی ہے، گلستانوں کو ویرانوں میں تبدیل کر لیتی ہے۔ معصوم کو ممتا کے لئے ترساتی ہے۔ ماؤں کی گود کو اجاڑ دیتی ہے۔ مانگ کا سیندور مِٹاتی ہے، بوڑھے باپ کے عَصا کو توڑتی ہے، بوڑھی ماں کی خمیدہ کمر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے نوخیز جوبن کو خزاں کے کنویں میں ڈھکیل دیتی ہے، شگُفتہ کلیوں کو کھِلنے سے پہلے ہی مَسل دیتی ہے، بادِ صبا کو روک دیتی ہے، چمن وشہر خموشاں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ غرض اس بُرائی کی ہزاروں خرابیوں کو جڑ سے اُکھاڑ دیا جائے تو پھر آج کی یہ تباہی و بربادی آپسی مخاصمت بھید بھاؤ، ذات ت اور مَیں اور تُو کے سارے جھگڑے دُور ہو جائیں گے اور ہمارے گلستان ں پھول ہی پھول ہوں گے نہ کہ راکھ کے ڈھیر۔ اس لئے کہ شاعر اقبالؔ نے ند کو سارے جہاں کا سب سے اچھا گلُستان کہا ہے اور ہم کو یہ ثابت کر دکھانا ہے نہ ہندوستان واقعی ایک گلُستان ہے۔ اس چمن کی کوئی نظیر نہیں۔ اس میں قسم قسم کے پھول ہیں ہر ایک کا الگ الگ رنگ ہے اور ہر ایک کی جاذبیت الگ ہے۔ ایک کی خوشبو دوسرے سے علحٰدہ ہے۔ ہر کیاری میں مختلف رنگ کے پھول کھِلے ہیں لیکن سب میں خوشبو دینے والا ایک ہی ہے وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے سب کو پھلنے اور پھولنے کی قوت عطا کرتا ہے اس چمن میں رہنے والے ہر ہندوستانی کا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے اپنی ساری توانائی صرف کر دے اس کی سالیمت پر آنچ نہ آنے دے وہ اس

میں نفرت کے بیج نہ بوئے۔ محبّت وخلوص اور آپسی مساوات کے ذریعہ اپنے کام کو آگے ہی آگے بڑھاتا جائے۔ ترقی کی راہوں پر چلتے ہوئے کامیابی کی منزلیں حاصل کرلے ورنہ یہ کالا دھواں۔جو منافرت کی آگ بھڑکا رہا ہے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لے گا۔

بہار کا اثبات چاہیئے

تعمیرِ کائنات میں امتیاز کا وجود نہ تھا۔ خالق نے بغیر کسی امتیاز کے کائنات کی تزئین کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ہر شئے کو برابر خوبی اور رعنائی بخشی اپنی تمام تر توجہ اس کے حسُن و جمال و رعنائی پر صرف کردی تب جاکر یہ گلُستاں وجود میں آیا اور پھر اس خوش نما گلُشن کے جلوؤں سے محظوظ ہونے کے لئے بَشر کا وجود ہوا اور پھر اس آدم نے اس کی آبیاری شروع کی۔ سب سے پہلے تو مَیں اور تُو کا جھگڑا کھڑا ہوا یعنی مَیں مَیں ہوں اور تُو تُو ہے یعنی دو میں فرق پھر تیرا اور میرا جھگڑا شروع ہوا۔ ہوتے ہوتے بَشر نے اپنی سطحی نظروں سے اپنے ہی ساتھیوں کو ناپنا تولنا شروع کیا۔ پھر تو کیا تھا طوفان امتیاز برپا ہوگیا۔ یعنی چھوٹا بڑا، امیر غریب، اُونچا نیچا، گورا کالا، خوبصورت بدصورت، کارآمد ناکارہ، عالم جاہل، توانا ناتواں، ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، بہر حال ہزاروں امتیازات تراش لئے گئے۔ اِس سمندر کی گہرائی کو ناپنے کے لئے گہری سوچ اور دل و دماغ کی ٹھنڈک درکار ہے۔

اگر انسان یہ سمجھ لے کہ باوجود ان تمام امتیازات کے سب انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، ایک ہی مقام پر رہتے ہیں، سب کی ضروریات زندگی بھی ایک ہی ہیں اور سب کی رگوں میں دوڑنے والا خون بھی سرخ ہی ہے، سب کے سب ایک ہی گلُستان کے پھول ہیں گو رنگت و رعنائی، نکہت و نکھار میں مختلف ضرور ہیں لیکن پھر بھی۔

ہے رنگ گُل و لالہ و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

تو پھر یہ تفرقے کا مسئلہ بڑا آسان ہوجائے گا اور کسی قسم کی دماغ پاشی کے بغیر ہمارے مسائل چاہے وہ معاشی ہوں یا سیاسی ہوں یا کہ مذہبی بڑی آسانی سے جلد از جلد حل ہوجائیں گے اور اس گلشن کے ہر گُل و برگ کو پھلنے پھُولنے کے مواقع مل سکیں گے بہار کے ہر جھونکے سے ہر ایک متاثر ہوگا اور تمام کے تمام مساویانہ طور پر اس سے مستفید ہوسکیں گے۔ مضبوط اور متحد ہوکر اپنے گلشن کی خود ہی آبیاری کریں گے اور حفاظت بھی تو پھر ڈر کاہے کا، جلنے کا ڈر نہ گرنے کا نہ سُوکھنے کا ڈر نہ بچھڑنے کا اور نہ ہی مرنے کا۔

کدورتِ پنہاں

زمانۂ قدیم میں وحشی قوموں نے جہالت کی بِنا پر درندگی کی مثالیں پیش کی ہیں چوں کہ جہالت و وحشت کا یہ عالم تھا کہ علم جیسی کوئی شئے انہیں چھو کر بھی نہ گئی تھی اور غالباً یہی وجہ ہوگی کہ انہوں نے درندگی کو اپنالیا تھا۔ تمدّن اور کلچر سے ان کا کوئی ساتھ نہ رہا تھا اور نہ ہی انہیں یہ پتہ تھا کہ شائستگی کس چڑیا کا نام ہے اور یہ شہر اور بستیاں کیا ہوتی ہیں اخلاق و انکسار کیا چیز ہوتی ہے سلوک و اسلوب کیا ہوتا ہے سماج و معاشرہ کونسے جانور ہیں۔ ایکتا اور یکجہتی کونسے پرندے ہیں تو بھلا اس کندۂ ناتراش، کو عَفو و درگذر سے کیا نسبت۔

تہذیبی دوَر کے شائستہ خیالات ہیں جن میں مذہب کا بھی خاصہ حصّہ ہے کہ غصّے کو پی جاؤ، دوسروں کے عَیبوں کی پَردہ پوشی کرو، محبّت و خلوص سے پیش آؤ چاہے وہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو، خفگی کا اظہار نہ کرو، گفتگو میں شیرینی اور نرمی ہو، چھوٹے اور بڑوں کا لحاظ رکھو، مصیبت میں غیروں کے کام آؤ، دُکھ درَد بانٹ لو، میل ملاپ سے رہو کہ اتّحاد و اتّفاق میں طاقت ہے، بُرائی سے ڈرو، نیکیاں جاری رکھو، عِلم کو پھیلاؤ، سماج کو سدھارو، امتیاز و تفرقہ سے باز آؤ اور عَفو و درگذر سے کام لو وغیرہ وغیرہ۔

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ ہم نے اس جدید ادبی و تہذیبی دور میں رہ کر اپنے علم وادب کے ذریعہ مندرجہ بالا باتوں پر غور کیا ہے اور کچھ سیکھا بھی ہے ؟

ویسے انسان کوئی فرشتہ تو نہیں لیکن پھر بھی اپنے علوم اپنے سماج و ماحول اور اپنی ذہانت سے ایسی صفات کو اپنا سکتا ہے جن میں آدمیت کی جھلک پائی جائے نہ کہ درندگی کی۔

دَورِ جدید میں رحم و کرم، محبّت و خلوص اور آداب انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور انسانوں نے اپنے دل و دماغ میں شیطنت کو پال رکھا ہے روزِ اوّل سے ہی شیطان نے انسان کو تباہی و بربادی اور بُرائی کی طرف پُرکشش انداز میں کھینچا ہے اور جس سے انسان نے وقتیہ آسودگی بھی محسوس کی ہے لیکن اس کے اِن اعمال نے کبھی انسان کو آدمیت کی طرف لانے کی کوشش نہیں کی کہ اس سے تو خدا اور اس کے بندوں کی خوشنودی ہوگی۔ اس لئے ہماری مذہبی تعلیمات نے ہمیں بھی درس دیا ہے بلکہ ساری دنیا کے مذاہب غالباً یہی درس دیتے ہیں کہ معاف کر دینے والے کا درجہ بہ مقابلہ بدلہ لینے والے کے اعلیٰ ہے گو کہ اِسلام نے بدلے کی اجازت ضرور دی ہے لیکن وہ صرف اس حد تک ہی ہو جتنی کہ دشمن نے اذیّت دی ہے بلکہ اگر درگذر و عفو سے کام لیا جائے تو پھر اِس کا مرتبہ بڑا عظیم ہے۔ لیکن اس حیوانیت اور مادّہ پرستی کے دَور میں ہم نے اپنی اِن اعلیٰ تعلیمات کو بھی نظر انداز کر دیا ہے اور بدلے کی آگ میں جل کر خاکستر ہو رہے ہیں بجائے اس کے کہ دشمن کو شرمندگی و پشیمانی کی تپش میں جُھلس دیا جائے۔ یہ تو اُسی وقت ممکن ہوگا جبکہ ہم دشمن کی توجہ اسی جانب مرکوز کریں۔ ہمارے افعال و اعمال ایسے ہوں کہ شرپسند

خود بخود ہماری طرف راغب ہوں اور اپنی پُرانی رَقابتوں ، کدورتوں اور خُصومتوں سے پاک ہوکر ہماری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور خلوص و محبّت کا سبق سکھیں۔

یہ کام دونوں کے لئے جان لیوا ہوگا۔ سخت دل آزاری و صبر و تحمّل کا وقت ہوگا کہ ایک طرف قاتل اور دوسری طرف مقتول۔ لیکن یہی وہ حالات ہوں گے جبکہ انسان عروج کے منازل پر پہنچ جائے گا اور ساری دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دکھائے گا کہ انسان میں درگذر کا مادّہ ابھی موجود ہے اور وہ خدا کی مخلوق میں سب سے اعلیٰ ہے۔

کہرام نہ سہی

ہمارا سماج اور ماحول ہندوستانی ہے اور یہاں کے رواج و رسومات پر اس کی گہری چھاپ ہے لیکن اب جیسے جیسے زمانہ گذرتا جارہا ہے سماج میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی نہ اب حالات ہی سازگار ہیں کہ خواتین خاموش رہیں اور ان کے تمام مسائل حل ہوجائیں۔

خواتین کی خاموشی نے سماج کو شہہ دی ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ پچھلے دو دہوں سے لڑکیاں ظلم و ستم کا شکار ہیں خودکشی کرلیتی ہیں یا کروائی جاتی ہیں۔ گھٹ گھٹ کے قدرتی موت کا انتظار کرتی ہیں۔ خاندان کی عزت و ناموس کے لئے صبر میں گھل جاتی ہیں۔

اگر موجودہ دور میں بھی لڑکیاں اسی روش پر چلیں تو پھر ظلم و ستم کا بازار اس حد تک گرم ہوجائے گا کہ صنفِ نازک نیست و نابود ہوجائے گی۔ حصولِ حق کے لئے اگر سماج میں ہلچل پیدا کی جائے یا تحریک ہو تو بہتر ہوگا۔ یہاں ہلچل او تحریک سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہنگامہ آرائی ہو۔ لڑکیاں اپنے بزرگوں کی مخالفت کریں یا پھر بے ادبی سے پیش آئیں بلکہ اگر وہ اپنے مسائل اور مصائب کو ہمارے سماجی رہبر اور ذی شعور حضرات کے سامنے پیش کرتی رہیں اور ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوں تو مسائل بڑی حد تک حل ہوجائیں گے اور سماجی برائیوں کا تدارک بھی ہوگا۔

عمر کے ظاہر ہوجانے کے خدشے سے، شادی بیاہ میں رکاوٹ کی وجہ سے،

حصول علم (اعلیٰ تعلیم) سے پہلوتہی کرنا تو سراسر نادانی ہوگی۔ شادی کے بعد بھی تعلیم کو جاری رکھا جائے تو بہت خوب۔ آج کل والدین میں یہ خیال ایک وبا کی شکل اختیار کرگیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے شادی میں رکاوٹ ہوگی۔ لڑکا تعلیم یافتہ نہ مل پائے گا لہٰذا تعلیم بھی کم ہو اور عمر بھی کم۔ لیکن ایسے والدین سے میری یہ گذارش ہے کہ اِس خام خیالی کو وہ اپنے دل سے نکال دیں کہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ یا ملازم لڑکی کو بھی ترجیح دی جاتی ہے۔

شمعِ علم روشن ہی نہیں پُرکشش بھی ہوتی ہے۔ دل و دماغ کو فہم و فراست سے معمور کردیتی ہے اسکے ساتھ ساتھ اگر عمل کا استادہ بھی ہو تو پھر کیا کہنے عورت کی آرائش میں چار چاند لگادیتی ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکی کا شعور اس کی اپنی ازدواجی زندگی کی کامیابی میں معاون ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ صبر و استقلال کا دامن نہ چھوٹے اور وہ اپنے اعمال سے اپنی سیرت کو بنائے رکھے۔

أجلا ميلا

ان دو لفظوں کے ساتھ ذہن میں صاف اور گندے کا خیال آتا ہے ۔ جیسا کہ اِن کے معنوں سے صاف ظاہر ہے ۔ ہاتھ اُجلے اور میلے ہو سکتے ہیں ۔ کپڑے اُجلے اور میلے ہوتے ہیں ۔ ماحول اچھے اور میلے ہوتے ہیں ۔ باتیں میلی یعنی گندی اور اچھی ہو سکتی ہیں ۔ سلوک اچھا اور بُرا ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ دل اُجلے اور میلے ہو سکتے ہیں ۔ یہاں پر لفظ اُجلا پاک اچھا اور پُر خلوص کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور میلا گندہ ناپاک اور بُرائی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ دُنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں پر بُرائی اور اچھائی دونوں ایک ہی ساتھ بڑھتے اور پلتے ہیں ۔ انسان کے ضمیر پر اس بات کا انحصار ہے کہ ان دونوں میں تمیز کرے اور جس میں خوبیاں ہوں اس کو اپنا لے اور اس میں خوب سے خوب تر ہونے کی کوشش کرے اور اپنے اندر کے انسان کو بھی پاکی کی طرف راغب کرے ۔ دنیا چونکہ ظاہرداری کو بہت زیادہ پسند کرتی ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگ ظاہری طور پر اُجلے ہونے لگے ہیں ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو ظاہری طور پر کافی اُجلے لباس میں ہوتے ہیں یہاں تک کہ رکھ رکھاؤ بھی بڑا نفیس ہوتا ہے لیکن دل میں مَیل بھرا ہوا ، بُرے خیالات بدتمیزی بدسلوکی جیسی بُرائیوں میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اسکے برعکس سماج کے نچلے طبقہ میں خاص کر جو بظاہر میلے کچیلے ہی دکھائی دیتے ہیں اپنے سینے میں ایک صاف ستھرا اُجلا سا دل رکھتے ہیں اور

انسانیت سے قریب نظر آتے ہیں ۔ طبعیت میں شگفتگی دل میں خلوص لئے ہر ایک کی مدد کرنے اور ہمدردی کا جذبہ لئے اپنے ماحول کو خوشگوار بنانے میں مصروف رہتے ہیں ۔ انہیں اپنے ماحول کی تنقید کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اسلئے کہ وہ تو سماج کو سدھارنے کا بیڑا اٹھالیتے ہیں لیکن کیا کریں کہ سماج انکی غربت انکے میلے لباس کو ہی لے بیٹھتا ہے انکے خلوص اور ہمدردی اور یکجہتی کو نظرانداز کردیتا ہے بُرے وقت پر وہ اپنے ساتھیوں کا بلالحاظ مذہب و ملّت مکمل طور پر ساتھ دیتے ہیں بمقابلہ اسکے اونچے مکانوں میں رہنے والے سماج کے بڑے عہدہ دار بھی اپنے دل کے کسی گوشہ میں اتنی ہمدردی نہ رکھیں انہیں تو بڑائی کی مصروفیت نے بُرائی کے کنویں میں ڈھکیل دیا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سماج کی اس خامی کو کس طرح بہتر موڑ پر لایا جائے کہ کوئی بھی بشر انسانیت کے دائرے سے نہ ہٹے اور اپنے تئیں ہر لحاظ سے اُجلا بنانے کی کوشش میں لگ جائے ۔ یہ تو سماج کے ہر فرد کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کا بہ غور مشاہدہ کرلے اور سب کو اپنے ساتھ لے لے اور پھر اس مشکل کام کا بیڑا اٹھالے تو ہر مشکل آسان ہوجائے گی اور ہر ایک کے دل میں یہ خیال گھر کرلے گا کہ اُجلے کو مکمل اُجلا بنائیں اور میلے کو مکمل اُجلا ۔

ٹکڑے ٹکڑے

چیزوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا بہت آسان ہے اُنہیں بگاڑ کر خراب کر دینا اور ناکارہ بنا دینا کوئی کمال نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی خوبی ہے۔ ویسے تو بچّے بھی جب اپنی چیزوں یا کھلونوں سے بیزار ہو جاتے ہیں تو انہیں توڑ دیتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ بعض وقت تجسّس کی بِنا پر انہیں توڑ مروڑ کر اُسکا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ بچّے تو بچّے ہی ہیں ہم نے بڑوں کو بھی چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے دیکھا یا تو نفرت سے یا پھر انتہائی غصّے کی حالت میں کسی بھی چیز کو چار ٹکڑوں میں پھاڑ کر یا کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شعراء نے بھی اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اپنے محبوب کو جگر کا ٹکڑا، دل کا ٹکڑا کہا ہے اور ٹوٹنے کی طرف بار بار اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے لیکن ان ٹکڑوں میں نہ تو دل کو کاٹ دیا جاتا اور نہ ہی اسکے کئی حصّے کئے جاتے ہیں بلکہ دِل کے خراب ہونے اور انتہائی غمزدہ ہوجانے کی طرف اشارہ ہے اسی طرح نثرنگار بھی اپنے مضمون کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اس کی تفصیل بتاتا ہے۔ ڈاکٹر کٹے ہوئے حصّوں کو جوڑتا ہے بعض وقت جسم کا کوئی عضو الگ ہوجائے تو اسکو جسم سے منسلک کر دیتا ہے غرض ٹکڑوں کو بہتر اور کار آمد بنانے کی کوششیں ہم نے دیکھی ہیں اسکے ساتھ ہی ساتھ سماج کے بعض افراد کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دینے کی خبریں بھی سُنی ہیں۔ کبھی دو ٹکڑے صرف سَر اور دھڑ کبھی چار اور کبھی بہت سارے۔ کبھی سَر کو کچل دیا جاتا ہے پتھر سے یا پھر بہت سارے ٹکڑے

کر کے انہیں صندوق یا ایک تھیلے میں ڈال کر کسی ویران جنگل یا نالے میں پھینک دیا جاتا ہے کہ کسی کو عِلم نہ ہو۔ لیکن پولیس کی نظر اور عدالت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں غالباً انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا اور نہ ہی اپنے ضمیر کی آواز کو سُنا ورنہ یہ مجرمانہ ڈھنگ اختیار نہ کرتے۔ انہوں نے اِنسان کے ٹکڑے نہیں کئے بلکہ انسانیت کے ٹکڑے کر دئے۔ امن اور شانتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے یہ وہی سماج ہے جہاں کی ایک بلند شخصیت نے ساری دنیا میں اَمن کا جھنڈا لہرایا اور خود کو (امن کا ٹکڑا) The Piece of Peace کے نام سے روشناس کروایا وہ ہیں پنڈت جواہر لال نہرو جنہوں نے اَمن اور شانتی کو اپنا شیوہ بنالیا تھا

اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں اس کا چرچا کیا تھا گویا کہ

یوں اَمن کا پرچم لے کر ہم دنیا کو سنوارا کرتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے سارے ملک بلکہ ساری دنیا کا بیڑا اٹھایا تھا اور ہم کم از کم اپنے اپنے دل اور ضمیر کو ڈھونڈ کر درست کریں اور دِلوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر نئی جہت پیدا کریں اور انسانیت و بھائی چارگی کو پروان چڑھائیں۔ اس لئے کہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلّت کے مقدّر کا سِتارہ

دہقانِ ناتواں

لفظ ناتواں گو کہ دہقان کے لئے ناموزوں دکھائی دے رہا ہے اسلئے کہ جو دوسروں کے لئے توانائی کا سامان مہیا کرتا ہو وہ کیسے ناتواں ہوسکتا ہے۔ وہ تو مکمّل توانا ہوگا اس کی محنت و مشقّت اسکی صحت و توانائی کی ضامن ہے۔ جو محنت سے جی نہ چُرائے بھلا بیماری اسکو کیسے مُنہ چڑائے۔ ہم اگر محنت و مشقّت کرنے والوں سے ذہنی اور دماغی کام کرنے والوں کا تقابل کریں تو پتہ چلے گا کہ اسکی دماغی رگیں گہرائی سے بھلے ہی نہ سوچیں سمجھیں لیکن اسکی ساری جسمانی توانائی پورے طور پر صرف ہوجاتی ہے۔ جب کہیں کھیت لہلہاتے ہیں فصلیں پکتی ہیں کھیت و کھلیان بھر جاتے ہیں۔ اناج کی بوریاں پھٹنے لگتی ہیں۔ بازار جمتے ہیں۔ دکانیں کھُلتی ہیں ضروریات زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ بھوک کے شعلے دبتے ہیں پیٹ ٹھنڈے پڑتے ہیں اور سارے شہری میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں۔

لیکن یہ سب اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم کسان کی فلاح کی طرف توجہ دیں۔ آج جبکہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر پاش پاش ہوچکیں۔ کسانوں کے نصیب نہیں جاگے۔ برطانوی سامراج نے بھی کسانوں کی طرف سے بے رُخی برتی وہ تو اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے پر مُصر تھے لیکن اب بھی ہم نے اُن کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ ہندوستانی معیشت زراعت پر ہی مبنی ہے بے چارے دہقان کو اسکی محنت کا پورا صلہ ملنا چاہیئے۔ اور اسکے ساتھ مکمل انصاف کی ضرورت ہے

تاکہ وہ پوری صلاحیتوں کے ساتھ کھیت کے کام میں جُٹ جائے دوسری تفکّرات جیسے کہ بیجوں کی سپلائی، کھاد کی سپلائی، ضروریات فصل اور اوزار زراعت جو سائنسی اور ٹکنیکل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مہیا کئے جائیں تاکہ فصل عمدہ اور نفع بخش ہو اور وہ اپنا اور اپنے کُنبے کا پیٹ پال سکے اور ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے قرض کا بوجھ جو اس نے اپنے کھیت کے لئے لیا ہے آسانی سے ادا کر پائے نہ کہ پھانسی کے سہارے اپنے آپ کا خاتمہ کرکے ناتوانی کا ثبوت دے۔

نیلا پانی

اکثر بڑے مجرموں اور قاتلوں کو اُن کے جرم کی پاداش میں زمانہ قدیم بلکہ دورِ برطانیہ میں بھی کالے پانی کی سزائیں دی گئیں اور مجرموں نے اس سزا کو بھگت کر پھر واپس آنے کے بھی کوششیں کیں۔ جرم جب ظاہر ہو جاتا ہے اور مجرم جب عدالت کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو سزا ضرور مل جاتی ہے اس لئے کہ عدالت کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہ دینا یا نہ دلوانا بھی ایک جرم ہے اس لئے سزا کا رواج ہی اس بات کا ضامن ہے کہ جرائم کو ختم کیا جائے ورنہ یہ سارے کا سارا سماج مجرموں کا اکھاڑہ بن جائے گا۔ اس لئے حکومت نے عدالت کے ذریعہ سزا کے مرتکب افراد کو مختلف قسم کی سزائیں دینے کا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ جُرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے اور آج تک یہی طریقہ رائج بھی ہے۔

لیکن یہ نیلے پانی والی کوئی حکومت اور عدالت سے دی جانے والی سزا نہیں ہے۔ یہ تو جُرم کو چھپانے کی پناہ گاہ بنی ہوئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پانی جُرم کو چھپا سکتا ہے نہیں بلکہ وقتیہ اس کا سہارا لیا جاتا ہے جیسے کسی نے جرم کیا اور پھر زندہ یا مُردہ عورت کو پانی میں ڈھکیل دیا تاکہ اس کا گناہ پانی میں ڈوب جائے اور پھر دائمی چھٹکارہ مل جائے۔ اسی طرح کسی نے قتل کیا اور اب اپنے آپ کو عدالت سے بچانے کے لئے نیلے پانی کا سہارا لیا۔ کوشش تو کرتے ہیں کہ زندہ بچ جائیں لیکن موت چھوڑتی نہیں۔ بعض نے تو مجرم کو سزا دلانے کے

بجائے خود ہی سزا پالی اور پانی میں ڈوبنے اور خودکشی کا سہارا لیا۔ کوئی سارے خاندان کو لے ڈوبا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری تاکہ بدنامی کا دھبّا ہی صاف ہوجائے اور کوئی سامنا نہ کرنے پائے۔ اور کوئی اس خیال سے پانی میں ڈوبا کہ تمام گناہ دُھل جائیں گے اور اگلے جنم میں بالکل ہی پارسائی کی زندگی گزاریں گے۔ کسی نے تو شیر خوار کی حسرتوں کا تک پاس نہیں کیا۔ بعض کہنہ مشق قاتلوں نے تو شک وشبہ کی بنا پر قاتل کے تمام رازداں اور دوست احباب کا بھی صفایا کر دیا ہے جن سے گواہی کے امکانات ہوں اور پھر انہیں نیلی لہروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لیکن قدرت کا کرشمہ ہے کہ سارے جُرم و مجرم پانی کی سطح پر آہی جاتے ہیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور پھر سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔ لیکن ان تمام مجرموں میں ایک طرح سے یکسانیت یوں پائی گئی کہ انھوں نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے اس جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔

ہمارے سماج کے بعض ارکان ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنا ذہنی توازن کھو کر پانی میں ڈوبنے کی کوشش کی۔ بعض وقت بچ گئے، بعض وقت ڈوب گئے۔ ذہنی توانائی کے لئے تو معالج و دواؤں کی ضرورت ہے لیکن جو مُجرم ذہنی طور پر ٹھیک ہوں ان میں کس چیز کا فُقدان ہے وہ کون سے بُرے حالات ہیں، جو انھیں اس طرح کرنے پر اُکساتے ہیں کیا اس میں کسی اور کا ہاتھ بھی ہے؟ کیا انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر یہ عمل کیا ہے؟ کیا ہمارے سماج نے انھیں یہی تربیت دی؟ ہر سماج میں اچھائی اور بُرائی ضرور شامل رہتی ہے لیکن بُرائیوں کے تدارک کے

الگ الگ ڈھنگ ہوتے ہیں ۔ یہ تو ایک مسلّمہ بات ہے کہ جب جُرم ہوگا تو اس کی سزا بھی ہوگی اور پھر جُرم کی نوعیت کے مطابق سزا ہوگی ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مجرم کی ہمت افزائی کے اسباب ؟ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سزاؤں میں ڈھیل ہے ۔ مجرم کو سخت سے سخت سزا کا ڈر ہو تو پھر وہ کبھی جرم کی طرف متوجہ نہ ہوگا اور اپنی زندگی کو مثالی بنانے میں کامیاب ہوگا ۔ ایک اچھے سماج کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ سزا سے ہٹ کر مجرموں کو جُرم کے ارتکاب سے پہلے یعنی ابتدا ہی میں انھیں اچھے اور بُرے کی تمیز بتادے ۔ ان کے ضمیر کی بہترین تربیت کرے تاکہ ایک پاک صاف ماحول پیدا ہو اور ہمارے سماج کا سر بلند ہو۔

تعلیم و خواتین

ویسے ساری دنیا کی قوموں نے ترقی کرلی ہے یا پھر ترقی کی راہوں پر ہیں ۔ عورتوں نے بھی اپنا مقام بنالیا ہے لیکن ہندوستانی عورت نے ابھی ترقی کی راہوں میں قدم رکھا ہی تھا کہ پُرانی رسومات اور رِواجوں نے راستہ گھیر لیا اور ہمارے سماج نے بھی اُسکو پروان چڑھایا ۔ ہمارے لئے شمعِ علم ہی ایک سہارا تھی جو کہ ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتی اور ہمیں آگے بڑھاتی جاتی تھی لیکن اب حالات کچھ اور ہوگئے ہیں علم سے خطرہ لاحق ہونے لگا ہے خاص کر شادی بیاہ کے معاملے میں ۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ علم کو محدود کردینے یا مختصر تعلیم دلوانے سے لڑکیوں کے شادی بیاہ کے مسائل حل ہوجائیں گے (بلکہ یوں ہو بھی رہا ہے) تو آہستہ آہستہ تعلیم کے شعبوں میں خواتین کا فیصد کم ہوتا جائے گا اور پھر اس بڑے مسئلہ سے کئی اور مسائل پیدا ہوجائیں گے اور ہندوستان میں تعلیم یافتہ خواتین کی بقا مشکل ہوجائے گی وہ یوں کہ اگر اسی رفتار سے لڑکیاں تعلیم ترک کرتی جائیں تو پھر تقریباً دو یا تین دہوں میں ایسا وقت آن پڑے گا کہ پروفیسرس ، ڈاکٹرس ، انجنیئرس ، ٹیچرس اور دوسرے شعبوں میں خواتین برائے نام رہیں گی یا مفقود ہوجائیں گی اور مستقبل میں جب بھی خواتین کی خدمات کی ضرورت ہوگی مثلاً زنانہ دواخانوں میں لیڈی ڈاکٹرس ، کالجس میں خاتون پروفیسرس وغیرہ تو اِن خدمات کے لئے باہر کی خواتین کی ضرورت ہوگی اور یہ ناممکن ہوجائے گا اس لئے کہ بہ مقابلہ بیرونی ممالک کے یہاں کی

معیشت کمزور ہے تو بھلا کس کشش سے بیرونی خواتین کی خدمات حاصل کی جاسکیں گی ؟ ان مسائل سے نہ صرف خواتین دوچار ہوں گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مرد بھی بہت کچھ متاثر ہوں گے اس لئے کہ یہ ان ہی کا بنایا ہوا مسئلہ ہوگا جو کہ یہ شکل اختیار کرچکا ہوگا اور پھر وہی قدیم مسائل ہمارے سامنے ہوں گے جن کو ہمارے آبا و اجداد نے بڑی مصیبتوں اور کاوشوں سے حل کیا تھا اور ایک جدید سماج اور معاشرہ کو نئی تہذیب و تمدن سے سجاکر پیش کیا تھا۔

ان غلطیوں کو کیسے دُور کیا جائے ؟ اس کے لئے کیا صرف عورتیں ہی ذمّہ دار ہیں ؟ کیا اس میں مردوں کا کوئی دوش نہیں ؟ کیا اس میں سماج کا ہاتھ نہیں ؟ اگر دُور اندیشی اور سمجھداری سے کام لیا جائے تو اب بھی ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے ۔ سماج کی اِن منحوس وباؤں کو دفع کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ تعلیم یافتہ لڑکے اعلی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی ترجیح دیں اور اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں تو خود کو بھی اس لائق بنائیں کہ وہ بھی قابل قبول ہوں تاکہ آئندہ آنے والی نسل کو تعلیم یافتہ باپ ہی نہیں تعلیم یافتہ ماں بھی مل سکے اور ان کی بہترین تربیت ہوسکے اور شمعِ علم ہمیشہ منوّر رہے اور ہمارے نونہالوں کو حصول علم کے لئے سازگار ماحول میسّر ہو ورنہ مستقبل قریب میں جہالت کا بول بالا ہوگا اور ایسا جاہل سماج اپنی اور قوم کی تباہی کا باعث ہوگا۔

فشین

ویسے تو لفظ فیشن کے کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں مثلاً۔ کپڑوں کا فیشن، انداز، اسلوب، سوچنے کا انداز یا ڈھنگ جو کئی لوگوں کو راغب کرے یا پھر سب لوگ اس کو اپنالیں۔ بعض دوسری زبانوں میں اس لفظ کے اور بھی کئی معنی ہیں مثلاً انگریزی ہی کو لیں۔

Style favoured and followed by most people in a region at a time

یا پھر:۔ Manner of doing something

یا:۔ Form_shape

یہ تمام معنی لئے جاسکتے ہیں لیکن موجودہ دور میں ہمارے معاشرے میں اس کے کیا معنی ہیں اور یہ کس حد تک ہمارے لئے فائدہ مند ہے۔ ہمارے سماج میں کپڑوں کے اسٹائیل اور انداز کو ہی فیشن کہا جاتا ہے لیکن بعض وقت تو انداز تخاطب بھی فیشن میں آجاتا ہے۔ کبھی کسی چیز کو ناپسند کرنا بھی ایک فیشن ہوجاتا ہے۔ کسی زبان کو نظر انداز کرنا بھی ایک فیشن ہے (جیسا کہ اردو زبان)۔ اپنی مادری زبان کے الفاظ کے بجائے انگلش الفاظ کا جابجا گفتگو میں استعمال ،اخلاق و آداب سے گریز کرنا بھی فیشن کہلاتا ہے۔ کالج کے طلبا میں یہ مرض زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

اپنی ضد پر اڑے رہنا بھی ایک فیشن ہے۔ ماں باپ یا بڑوں کا مذاق اڑانا

بھی ایک فیشن ہے۔ بات چیت میں تصنع اور بناوٹ بھی ایک انوکھا فیشن ہے۔

میرا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ مندرجہ بالا باتوں کو فیشن کے زمرے میں پایا گیا۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان فیشنوں سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟ ان تمام باتوں سے چند ہی ایسی باتیں ہوں گی جو فیشن کہلائی جاسکتی ہیں اور جن کو سوچ سمجھ کر اپنانا فائدہ بخش ہے۔

ہمارے معاشرے کا نوجوان طبقہ اگر کپڑوں کا نیا اسٹائیل بشر طیکہ وہ انہیں سوٹ (Suit) ہو، اپنا لے، بات چیت کا انداز بہتر ہو اس سے بھی گریز نہ کرے تو بہت خوب۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ (خاص کر کپڑوں میں) چاہے وہ فیشن بے ہودہ بھی ہو، جس سے جسم کی نمائش ہو اور پھر تکلیف دہ بھی ہو تو اپنا لیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو ایسے لباس کا انتخاب کرنا چاہیئے جس سے تمام جسم چھپا رہے اور ساتھ ہی ساتھ چلنے پھرنے یا بس میں سفر کرتے وقت یا اور کوئی کام کرتے وقت لباس سے کوئی حرج نہ ہو۔ خوشنما ہو اور اپنے جسم پر اچھی طرح جچے نہ صرف خوبصورتی میں اضافہ کرے بلکہ عمر اور موٹاپا بھی چھپالے۔ یہی تمام باتیں لڑکوں کے لئے بھی بہتر ہوں گی۔

یہ تو ہوئی خوبصورتی اور خوشنمائی کی بات اور لباس کی تراش خراش کی۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بجائے گھر کے ٹی وی سے مستفید ہونے کے تھیٹر کو جانا وہاں بڑے اسکرین پر ہزاروں مصیبتیں اٹھا کر

پکچر دیکھنے کو بھی فیشن میں داخل کر لیا گیا ہے۔

نئی فلم پہلے دن دیکھنا تو اور بھی قابل تعریف مانا جاتا ہے اور فلم کی باتوں سے ناواقفیت کو جہالت میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اکثر لڑکیاں ہیروئن کی بلاسوچے سمجھے تقلید کرتی ہیں جو سماج و معاشرے کے لئے ناروا ہے۔

اب رہا بات چیت کا انداز۔ سب سے پہلے تو بات چیت کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ کس سے مخاطب ہیں۔ ہر صورت میں خلوص، سادگی اور ہمدردی ان تینوں کا میل ضروری ہے۔ آواز میں نرمی اور آہستگی ہونی چاہیئے۔ غیر ضروری تصنع اور بناوٹ سے شخصیت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر جوں کا توں سیکھنے سے پہلے دل ودماغ سے بھی کوئی کام لیا جائے۔

شکمِ داغدار

سماج میں ہزاروں قسم کی بُرائیاں ، کوتاہیاں اور خرابیاں پائی گئیں ہیں جن میں سے اکثر ناواقفیت ، جہالت ، لاعلمی اور غیر ضروری دوست احباب کے اصرار پر بھی سرزد ہوئی ہیں ۔

سماج نے ان باتوں کی طرف توجہ نہ دی ایک تو اس خیال سے کہ آہستہ آہستہ یہ باتیں ٹھیک ہوجائیں گی یا پھر اس کے لئے وقت لگے گا ۔ میری نظر میں لاعلمی اور جہالت اس کی خاص وجہ ہوسکتی ہے ۔ انسان خواہ وہ جاہل ہو یا لاعلم تھوڑی دیر کے لئے کسی کام کے کرنے سے پہلے اس پر غور کرلے اور اندھا دھند نقل کرنے یا عجلت میں فیصلہ کرنے کی بجائے اپنے ضمیر کو ٹٹول لے ۔ پرسوں ہی اتّفاق سے ملازمہ کے پیٹ پر نظر پڑی ۔ پہلے تو ہم نے اس کو کوئی بیماری یا پھر کوئی اور وجہ تصوّر کرکے نظرانداز کردیا لیکن پھر ایک دن اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے تیار ہوگئے اور پھر پتہ چلایا گیا تو معلوم ہوا کہ پیٹ پر یہ جو آڑے ترچھے نشانات گویا کہ یہ تو چرکے ہیں ۔ یہ کیوں کر نمودار ہوئے ۔ تو کہنے لگی کہ چرکے دینے کا دیہاتوں میں رواج ہے ۔ ویسے خیال آتا ہے کہ ہمارے بچپن میں بھی ہم نے کسی کی زبانی یہ بات سُنی تھی کہ پہلے کے لوگ بچّہ پیدا ہوتے ہی اسکے ہاضمہ کی بہتری کی غرض سے اس معصوم جان کی پیدائش کے نویں یا بارھویں دن ایک باریک لوہے کی سیخ کو اتنا زیادہ گرم کیا جاتا ہے کہ وہ سرخ ہوجائے اور پھر اس کو وہاں کے (یرکاوا اڈولو) یعنی چرکا دینے والے حکیم

صاحب اپنے مختلف زاویوں سے معصوم کے پیٹ پر مختلف انداز میں ان گرم سلاخوں سے چُرکا دیتے ہیں اُن کا یہ خیال کہ اس عمل سے بچوں کا دودھ پچ جائے گا اور قئے وغیرہ بھی نہ آئے گی۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ یہ تو اُن کا ضمیر اور اُن کا علم ہی اس بات کو ثابت کرے گا یا پھر ڈاکٹر حضرات سمجھ پائیں۔

آج کل کے اس انتہائی سائنسی دَور میں جب کہ سائنس اور ٹکنالوجی اپنی ترقی کی منزلوں پر ہیں اس بُرائی کو جہالت کہا جاسکتا ہے۔ یہ بعض مقامات پر اب بھی موجود ہے نہ معلوم معصوم بچوں کو جن کی جان بڑی نازک ہوتی ہے اس حد تک تکلیف دے کر ان کی بھلائی کا سوچنا کہاں تک درست ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ ظلم اور بربریت ہے۔ ایسی تکلیف سے صحت کا حصول تو ہماری عقل سے دوٗر ہے۔ دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ بعض مقامات مثلاً پسلی پوڈو، نلورو، کالیرو، چلیرو، اچاداپرا، ولورو، مایا ٹورو کے نواحی علاقوں میں آج ی کہیں کہیں یرکاوا ڈو نظر آتے ہیں اور اپنی اس طرح کی حکمت جاری رکھے ۓ ہیں محکمہ صحت اور طِب کے ماہرین اس مسئلہ پر غور کریں اور دیہاتوں یں ڈاکٹرس کی جو ٹیمیں روانہ کی جاتی ہیں وہ سماج سے اس جاہل حکمت کی جڑیں کال باہر پھینکیں تاکہ معصوم بچّے اس تکلیف سے نجات پاکر میٹھی میٹھی دواؤں کے ذریعہ اپنی صحت کو بہتر بناکر ملک کے طاقتور معمار بن جائیں۔

احوال

بے عنوان بات چیت سے انسان بہت جلد اُکتا جاتا ہے ۔ ہمارے معاشرے میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی بھی معمولی سی بات کو لے کر اس کی ایک بہت بڑی بحث چھڑ جاتی ہے اور سارے سامعین اس میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی خاص عنوان پر اگر کوئی سیر حاصل بحث ہو تو پھر اس کا نتیجہ اخذ ہو جاتا ہے ورنہ ساری توانائی غیر ضروری باتوں پر صَرف ہو جاتی ہے ۔ بڑے بزرگوں کا کہنا ہے کہ زیادہ باتیں کرنے سے ذہن کمزور ہو جاتا ہے اور قوتِ سماعت پر بھی اثر پڑتا ہے اس لئے کہ باتیں کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی باتوں کو سُننا بھی پڑتا ہے ۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کم سُخن کو خود غرض یا مغرور کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ کم بات کرتا ہے اور خاص کر جب بہت ہی ضروری ہو تو وہ باتیں کرتا ہے اسکے ساتھی اس پر " Reserve " کا لیبل لگادیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بھی زیادہ گفتگو کی عادت پائی گئی ہے ۔ بعض لوگ بہت زیادہ باتیں کرکے یا تو دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں یا پھر سامنے والے کو غیر ضروری مصروف رکھنا ان کا مقصد ہوتا ہے تاکہ وہ دوسری طرف متوجہ نہ ہونے پائے ۔ گفتگو کا یہ ڈھنگ بہت ہی بے ڈھنگا اور بے کیف ہوتا ہے ساتھی ان کی باتوں سے جلد بیزار ہوجاتے ہیں۔ سار

چلتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کام بھی

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی

اچھی باتوں پر عمل کیا جائے یا پھر باتیں کام کی ہوں مثلاً کسی معلوماتی عنوان پر بحث ہو یا کوئی موجودہ سیاسی پہلو والا عنوان ہو تو ایسی باتیں فائدہ بخش ہوں گی۔

یہ تو ہوئی بحث صرف باتوں پر کہ باتیں کیسی ہونی چاہیئے اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن کے ذریعہ ہم کون کون سے کام انجام دے سکتے ہیں۔ ملاقات کے پہلے حصّے میں ہی عام طور پر سلام کے بعد جو کلام شروع ہوتا ہے اس میں زیادہ تر خیر و عافیت پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ گفتگو شروع کرنے کا بڑا اچھا ڈھنگ ہے۔ بے تکلّف انداز میں راست بات چیت ہوتی ہے اور صرف مقصد کے تحت ہی ہوتی ہے اور پھر ایک مزاحیہ انداز میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے آج کل تو ایک رواج یہ چل پڑا ہے کہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر خیر و عافیت کو بھلا دیا گیا ہے یا پھر احوال کو انتہائی مختصر بنا دیا جاتا ہے اور صرف ایک مسکراہٹ یا صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہی اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ہمارے مشرقی احباب نے بھی مغربیت کو اپنا لیا ہے۔ سُنا ہے کہ وہاں کے لوگ بہت مصروف رہتے ہیں اس لئے کہ انہیں آپس میں بات کرنے کی فرصت نہیں ہوتی لہذا آس پاس کے لوگ یا پڑوسی ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں یہاں تک کہ سلام علیک بھی نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں ایک ایسی فیملی بھی ہے جو کام کی انتہائی مصروفیت کی وجہ سے شوہر اور بیوی کی ملاقات صرف راستہ میں ہوتی ہے ایک سکنڈ کے لئے یعنی ہاتھ ہلا کر گویا کہ وہ ملاقات کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے لوگ اگر مصروف نہ بھی ہوں تو دُور سے ہی اپنا رُخ اور راستہ بدل ڈالتے ہیں۔ حالانکہ

اپنے دوست اور احباب سے انکے احوال پوچھنے سے نہ صرف ہمارے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں بلکہ اُن کے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے اور ان کے اہل و عیال کے بارے میں پوچھنے سے دوست کی اُنسیت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور دوستی کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ بھی آپ کیطرف خوشی سے متوجہ ہوجاتے ہیں۔ غرض دوستی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اس طرح کے آپسی روابط سے دِلوں کو سکون ملتا ہے ایک دوسرے کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجاتا ہے احوال پوچھنے سے بعض وقت وہ اپنے نجی حالات بھی بیان کر دیتے ہیں لیکن ان باتوں میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسلئے کہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کے دوست آپ کی نجی باتوں کو مخفی ہی رکھیں اور ایسی باتوں سے بھی احتراز کیا جائے جس سے دوستی میں رَخنے پڑنے کا ڈر ہے۔ اسی طرح تحریری ملاقات میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے گو کہ خطوط کے ذریعہ احوال کی آگاہی ہوتی ہے لیکن بعض دفعہ طنزیہ تکلیف دہ باتیں خطوط میں پوچھ لی جاتی ہیں جو ہمارے سماج میں ایک وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

ایک اچھے اور مثالی انسان کی یہی صفت ہے کہ وہ اپنے دوست احباب اور پاس پڑوس کے احوال سے واقف ہو اور وقت ضرورت ان کا مددگار و معاون بھی ثابت ہو۔

قربتِ قلوب چاہیے

بے دَرد زندگی بھی کیا زندگی ہے انسان تو وہی کہلانے کا مستحق ہے جو خود میں اِنسانیت کا درد رکھے ۔ اِنسانیت بذات خود درَد، غم، خوشی، خلوص، محبت، ان تمام جذبات کا مرکب ہے لیکن سب سے اعلیٰ و ارفع جذبہ درَد کا جذبہ ہے یعنی ہمدردی کا جذبہ اگر ہر بشر کے دل میں یہ جذبہ سرایت کرجائے تو پھر اِنسانیت جاگ اٹھے گی۔ اور انسان کے اندر کا آدمی اپنے اعلیٰ جذبات کے تحت کارِخیر کی طرف راغب ہو گا۔ کارِ خیر ہزاروں قسم کے ہیں۔ ہر وہ کام جس میں شرَ کا شائبہ نہ ہو خَیر ہی کہلائے گا۔ مثلاً اپنی ذات کی بھلائی کے لئے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے، دنیاوی نفع کے لئے اپنے احباب کی خوشی اور ذہنی تسکین کے لئے روحانی قوت کے لئے، راحتِ قلب کے لئے، یہاں کارِخیر سے مطلب ہر وہ کام جس سے کہ ساری اِنسانیت کو فائدہ پہنچے اور پھر اس کا مقصد و مدّعا بھی انسانیت کا سُدھار ہو اور اتنا ہی نہیں بلکہ جس سے ہماری ذات کو یہ فائدہ پہنچے کہ ہمارے قلُوب کو راحت و آسودگی میسّر ہو۔ یہ سب اُس وقت ممکن ہے جب ہم اپنے مذہب کے بتائے ہوئے اُصولوں پر صحیح طرح گامزن ہوں اور اپنی تمام ترَ توانائی صدقِ دل سے اپنے سماج اور برادری کی بہبودی کے لئے صرف کردیں اس لئے کہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو انسانیت کی بربادی چاہے اور نہ ہی کوئی ایسا مذہب ہے جس نے اپنے عقائد کی بنا پر انسانی جانوں سے کھیلنے کی ترغیب دیتا ہو تو پھر کیوں مذہب کے نام پر انسانیت کی قربانی دیں

بجائے اسکے کہ اِنسانیت کی بقا کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں۔ انسانیت اور ہمدردی ہی وہ واحد احساس ہے جو کہ کرۂ ارض پر رہنے والے بشر کا خاص وصف ہے اور یہ جذبہ اُسی وقت کارفرما ہوگا جب کہ ایک انسان کا دل دوسرے سے قریب تر ہو اور عقل و ایمان کی روشنی میں سب ایک جان ہوکر نفرت، تفرِقہ، خصُومت، کدُورت، بُغض، کینہ کپٹ سے دلوں کو صاف کرلیں۔

دل صاف کرلے احمد پہلے کدُورتوں سے
پھر شکل اپنی دیکھ آئینہ ساز ہو جا

ہمارے عقائد و مذاہب دِلوں کو جوڑنے کے لئے ہیں نہ کہ توڑنے کے لئے۔ جو اِنسانی دلوں میں محبّت اور ہمدردی کا جذبہ جگادے اس کا مرتبہ دین و دنیا دونوں میں بلند ہوتا جاتا ہے۔ ہمارا ہر کام ایسا ہو کہ جس سے نہ صرف ہمارے دل و دماغ کو فرحت ملے بلکہ ہمارا سارا معاشرہ بھی ہمارے حرکات و سکنات سے متاثر ہوئے بنا نہ رہے۔

عقائد بھی سطحی نہیں ہوتے اپنے دامن میں بڑی گہرائی سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے مذہبی رہنمایانہ اصولوں سے ہماری کردار سازی ہوتی ہے۔ مذہب سے انسان بنتا ہے نہ کہ بگڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نونہالوں کو ہم بچپن سے ہی مذہبی معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ سیدھے راستے پر چل کر اپنے اخلاق و کردار کو بنائے رکھیں اور اپنے معاشرے کے ایک بہترین رکن اور